عصر حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات

محمد عمر اسلم اصلاحی

لاریب عصر حاضر نے عالم انسانیت کو بے شمار وسائل و ذرائع سے نوازا ہے اور انھیں اسباب تعیش سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس نے ارتقا کی جتنی راہیں اب کھولی ہیں، پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے انتہائی پر مشقت اور پر محن زندگی گزارتے ہوئے وسائل حیات کے حصول کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنا پڑتا تھا لیکن اب A.C میں بیٹھ کر محض انگلیوں کی حرکتوں سے بڑے کام کیے اور بڑے نام پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے جو مسافت ہفتوں اور مہینوں میں مشکل سے طے ہوتی تھی اب وہ گھنٹوں اور دنوں میں بڑے آرام سے طے ہو جاتی ہے۔ پہلے کسب معاش کے لیے انتہائی پاپڑ بیلنے پڑتے تھے مگر اب ایک آرام دہ آفس میں بیٹھ کر کروڑوں اور اربوں کا کاروبار کر لیا جاتا ہے۔ پہلے اپنے دور افتادہ اہل تعلق سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مہینوں انتظار کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی تھی اور اب سکنڈوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بآسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ پہلے اہل تحقیق کا مآخذ و مصادر کی تلاش میں دور دراز کے سفر کرنے پڑتے تھے اور متعدد لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑتی تھی لیکن اب منٹوں میں تمام مراجع و مصادر تک رسائی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ دنیا نے بڑی ترقی کی ہے اور عصر حاضر کے وسائل نے انسانی ترقی کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن اس تلخ حقیقت سے بھی شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ ان تمام مادی ترقیات کے باوجود انسانوں کے اندر روحانی اعتبار سے تشویش ناک حد تک انحطاط آیا ہے۔ اسی لیے وسائل کی فراوانی کے باوجود مسائل اتنے پیدا ہو گئے ہیں کہ انسانیت کراہ رہی ہے اور دنیا

کا کوئی خطہ یا انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو روز افزوں مسائل کا رونا نہ رو رہا ہو۔ علم و تحقیق اور عروج و ارتقا کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ مسائل کا انبار ایک کربناک حقیقت ہے۔ اس سے بھی زیادہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ یہ خود انسانوں کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ خالق و مالک کائنات بھی یہی کہہ رہا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔ (الروم/۴۱)

بر و بحر کے اندر رونما فساد لوگوں کی اپنی کمائی کا نتیجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر انسانوں نے خود یہ مسائل کیوں پیدا کیے؟ دل سے پوچھیے تو اس کا جواب یہ ملے گا کہ یہ مسائل انھوں نے دانستہ پیدا نہیں کیے بلکہ یہ مسائل ان کی جہالت سے پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن جو لوگ حقیقت کی زمین پر زندگی گزارنے کے بجائے فسانوں کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے عادی ہیں وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ اتنا پڑھا لکھا انسان جاہل کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے، حالانکہ اگر صرف اس ایک پہلو پر نظر چلی جائے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے کی عرب دنیا کو جاہل اور اس عہد کو عہد جاہلیت کہا جاتا ہے جب کہ ان کی خطابت و شاعری کو آج عربی زبان و ادب کا معیار مانا جاتا ہے تو آج کی نام نہاد علمی دنیا اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تامل نہ کرے۔

ہمیں اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ نور علم اور بصیرت سے محروم آدمی مخزن علوم ہونے کے باوجود جاہل ہی رہتا ہے کیوں کہ وہ خزانۂ معلومات جس میں نور علم اور بصیرت نہ ہو عقل پر پڑے ہوئے پردۂ جہل کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اسی لیے عام طور پر یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور ڈگری ہولڈر ایسی بے عقلی اور جہل کی باتیں کرتے ہیں کہ عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَوْ أَنَّنَا أَنْزَلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ

اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں

اللّٰـهُ وَلٰـكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ۔ (الانعام/۱۱۱) جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے۔ لیکن ان کی اکثریت مبتلائے جہل ہے۔

انسان کا یہی جہل ہے جس کی وجہ سے وہ گہر اور پشیز میں تمیز کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ گہر اور پشیز میں تمیز کرنے کے لیے جس علم وبصیرت کی ضرورت ہے وہ اللہ کی کتاب قرآن مجید سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید ہی انسانوں کو معرفت نفس اور عرفان خداوندی بخشتا ہے۔ جسے ان دو حقیقتوں کا شعور حاصل ہوجائے وہی فی الواقع عالم ہے اور جسے یہ علم حقیقی حاصل ہوجاتا ہے وہ اپنا ہر کام اللہ رب العالمین کے لحاظ ورضا کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء ۔ (الفاطر/۲۸) اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ڈرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں علماء سے مراد صرف وہی ہوسکتے ہیں جنھیں معرفت نفس اور عرفان خداوندی حاصل ہو اور یہی حقیقی شرف انسانیت ہے اور جو شخص اپنا جوہر شرف انسانیت کھودے اس کی حیثیت دوٹانگ کے جانور سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ پھر بھلا اسے عالم کیوں کر کہا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ، أُولٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ۔ (الاعراف/۱۷۹) یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، یہی لوگ دراصل غافل ہیں۔

یہاں جانوروں سے بھی گیا گزرا انھیں اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ جو وصف انھیں جانوروں سے ممتاز کرتا وہ وصف انھوں نے خود اپنے ہاتھوں گنوایا اور اپنے اختصاص وامتیاز کی دولت گرانمایہ انھوں نے خود ضائع کی ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ جانور کہلانے کے حق دار بھی نہیں رہ جاتے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت کہ آج کی نام نہاد مہذب دنیا نہ اپنے آپ کو پہچانتی ہے اور نہ اپنے پروردگار کو، اس کی یہ بے خبری اور جہالت نتیجہ ہے حقیقی دستور حیات قرآن

مجید سے بے اعتنائی اور تابندہ نقوش اسوۂ رسول ﷺ سے بے رغبتی کا۔ اسی بے خبری اور جہالت نے ہزاروں مسائل جنم دیے ہیں جن کا احاطہ نہ تو ممکن ہے اور نہ اس اصولی گفتگو میں اس کی ضرورت ہے۔

عصر حاضر کے مسائل

اب آیئے اس امر پر غور کیا جائے کہ ان دونوں اساسات (قرآن وحدیث) کو چھوڑ دینے یا کم از کم انھیں خاطر خواہ اہمیت نہ دینے سے کیا کیا مسائل پیدا ہوئے؟

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ مسائل تو بے شمار ہیں جن کا استقصا ممکن نہیں لیکن بعض مسائل جن کے اثرات ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہیں اور جو دیگر مسائل کی جڑ بھی ہیں ان کا جائزہ لینا ضروری ہے اور اس مقالہ میں ان سب کا جائزہ ممکن نہیں ہے، اس سلسلہ میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ پہلے تو یہ احساس ہو کہ یہ واقعی مسائل ہیں، کیونکہ مسائل کے احساس کے بغیر ان کا حل نہیں نکالا جاسکتا۔ عصر حاضر کے بنیادی انسانی مسائل پانچ ہیں جنھیں جملہ مسائل کے سرچشمہ کی حیثیت حاصل ہے:

۱- اخلاقی انحطاط ۲- غیر متوازن نظامِ تمدن ۳- نظام معاش کی ناہمواری
۴- سیاسی شعور کا فقدان ۵- دہشت گردی۔

اخلاقی انحطاط

اخلاق کسی بھی انسانی سماج، سوسائٹی، جماعت یا ادارہ کی زندگی اور بقا کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اخلاق نہ ہو تو کسی سماج یا سوسائٹی کو مہذب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اخلاق نہ ہو تو جماعت یا ادارہ کی ترقی تو کجا اس کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر تمام مذاہب میں اسے بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اگر اخلاق ہو تو دیگر تمام کمزوریوں کے باوجود سماج کی تعمیر وترقی کی امید کی جاسکتی ہے۔ کفار ومشرکین نے جب اللہ کے رسول ﷺ پر مختلف طرح کے رکیک حملے کیے اور آپ کی ساکھ کو مجروح

کرنے کی ناروا کوشش کی تو اللہ نے اپنے رسول کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (القلم/۴) اور تم ایک عظیم اخلاق پر ہو۔

گویا آپؐ کے عظیم اخلاق کا حوالہ دیتے ہوئے اور آپؐ کی اور آپؐ کے مشن کی کامیابی کی ضمانت دی۔

انسانی سماج میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن عصر حاضر میں اخلاقی دیوالیہ پن کا حال یہ ہے کہ کسی سطح پر بھی اخلاق تلاش بسیار کے باوجود نظر نہیں آتا، افراد کی حد تک تو اس میں استثنا ہو سکتا ہے لیکن جماعتی حیثیت سے شاید اس اعتراف کے بغیر چارہ نہ ہو، حالانکہ نظری طور پر ہر طبقہ، جماعت یا ادارہ کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں اور ہر ایک کو دوسروں سے اخلاق کا مطالبہ کرنے کے بجائے خود اپنی اخلاقیات کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اگر اصولوں اور ضابطوں کی بات کی جائے تو حکمرانوں، ماتحتوں، امراء، مامورین، اساتذہ، طلبہ، سرپرستوں، مالکوں، مزدوروں، ذمہ داروں، کارکنوں، والدین، اولاد، شوہروں، بیویوں، پڑوسیوں، مالی امداد کرنے والوں، مالی اعانت حاصل کرنے والوں، قرض دہندوں، قرض خواہوں، دوستوں، ساتھیوں، سواروں اور پاپیادوں سب کی اپنی اخلاقیات ہیں۔ یہی اخلاقیات تمام طبقات کو اپنی حدوں میں رہتے ہوئے شریفانہ انسانی زندگی گزارنے کا گُر سکھاتی ہیں اور چونکہ سماج کے یہ تمام طبقات ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طور سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے ان میں اخلاقی بلندی از بس ضروری ہے کیونکہ سماج کے کسی ایک طبقہ کا اخلاق بھی اگر بگڑ جائے تو دوسرے متعلق طبقات پر اس کا اثر لازمی ہے خواہ وہ ردعمل کے طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اجتماعی اخلاق کو بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ انھیں دینی چاہیے جن کی حیثیت راعی اور رہبر کی ہے۔ ان کے احساس اور توجہ کے بغیر اخلاق کا موجودہ بحران ختم نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی انحطاط ہمارے موجودہ عہد کا اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ اس نے تمام دائروں کو توڑ دیا ہے اور سارے حدود و قیود پامال کر کے رکھ دیے ہیں۔ سطور ذیل میں اخلاقیات کے چند نمایاں عناصر پر بحث کی جائے گی۔

عناصر اخلاقیات

یوں تو اخلاقیات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن اس کے نمایاں عناصر ہی پر گفتگو کافی ہے۔ صدق، صبر، اعتدال، احسان، ایثار، ایفائے عہد، استغناء، سخاوت، تحمل، عدل اور انکساری اسی شجر سایہ دار کے برگ و بار ہیں۔ قرآن مجید نے چونکہ ان اخلاقیات کو پروان چڑھانے پر بڑا زور صرف کیا ہے اس لیے ان کی ہلکی سی تشریح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

صدق

صدق نام ہے کسی چیز کا مطابق واقعہ ہونا۔ اگر زبان دل سے ہم آہنگ اور ظاہر و باطن کے ہم رنگ ہو، عمل قول کے مطابق اور فعل عقیدہ کے موافق ہو اور دلیل دعویٰ کے ہم عنان ہو تو کہا جائے گا کہ یہاں صدق پایا جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو چند واقعات اور مثالوں سے سمجھنا مفید ہوگا۔

قرآن کی متعدد تعلیمات پر یہود کو بڑا اعتراض تھا۔ ان کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ قرآن نے کیسے بعض ایسی چیزوں کو بھی حلال کر دیا جو پچھلے انبیائے کرام کے زمانہ سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ مثلاً اونٹ کا ذبیحہ اور قربانی تو حرام تھی قرآن نے اسے حلال کیسے کر دیا؟ حالانکہ ان کا یہ اعتراض غلط تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام محض طبعی کراہت کی وجہ سے اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے یہود نے اپنے پیغمبر کی اتباع اور عربوں کی مخالفت میں اسے باقاعدہ اپنے اوپر حرام کر لیا اور اپنے اس عمل کو شرعی بنانے کے لیے انھوں نے تورات میں تحریف کر دی تاکہ لوگ جب پوچھیں کہ کس بنیاد پر اونٹ کا گوشت حرام سمجھا جا رہا ہے تو وہ تورات سے دلیل پیش کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں قرآن مجید میں فرمایا:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (آل عمران/۹۳)

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں کہہ دو کہ لاؤ تورات اور اس کو پڑھو، اگر تم سچے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارا یہ دعویٰ درست ہے کہ اونٹ کا گوشت پہلے سے حرام چلا آرہا تھا قرآن نے اسے حلال کردیا ہے تو لاؤ اصلی تورات اور دکھاؤ، کہاں اس میں اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہاں دعویٰ کی دلیل لانے کے لیے چیلنج ان لفظوں میں کیا گیا ہے کہ "ان کنتم صادقین"۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر کفار ومشرکین کے دس ہزار سے زائد کے لشکر جرار نے جب نوزائیدہ اسلامی ریاست کے مرکز مدینہ کا محاصرہ کیا تو منافقین نے یہ پروپیگنڈا شروع کردیا کہ جناب پیغمبر تو ابھی تک یہ فرما کر ہمیں بہلا رہے تھے کہ:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ. إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ. وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۔ (الصافات/۱۷۱-۱۷۳)

اور ہمارا یہ کلمہ ہمارے پیغمبروں کے لیے گزر چکا ہے کہ انھی کی مدد کی جائے گی اور بے شک ہماری فوج ہی غلبہ پائے گی۔

لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بنیادی ضروریات تک کے لیے گھر سے باہر نکلنا دشوار ہے۔ قرآن نے ان کا تبصرہ یوں نقل کیا ہے:

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُوراً۔ (الاحزاب/۱۲)

اور یاد کرو اس وقت کو جب منافقین اور وہ جن کے دلوں میں روگ تھا یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے سب فریب نکلے۔

اس موقع پر اہل ایمان کا جو رویہ تھا قرآن نے اسے یوں نقل کیا ہے:

وَلَـمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَـذَا مَـا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّـهُ وَرَسُولُـهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَاناً وَتَسْلِيماً۔ (الاحزاب/۲۲)

اور سچے اہل ایمان نے جب حملہ آور لشکر کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا، اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا، اس واقعہ نے ان کے ایمان اور خود سپردگی ہی میں اضافہ کیا۔

ان اہل ایمان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تھا:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ۔ (البقرہ/۲۱۴)

کیا تم لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تمھیں جنت میں داخلہ یونہی مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے یہاں تک کہ رسول اور اس کے اہل ایمان ساتھی چلا اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔

چونکہ ان اہل ایمان کے سامنے اللہ کا یہ قول تھا کہ جنت پانے کے لیے مصیبتوں اور سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا اس لیے جب ایک لشکر جرار سے سخت مقابلے کی آزمائش سامنے آئی تو اس کے پیچھے انھیں اپنی کامیابی نظر آئی اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا "صدق الله ورسوله"۔

حضرتؑ یوسف علیہ السلام بازار مصر میں فروخت ہوکر عزیز مصر کے دربار میں پہنچ گئے اور بہت جلد اس کے نور نظر بن گئے، اسی کے ہاں پلے بڑھے اور جب پرکشش جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو عزیز مصر کی بیوی کی تمنا بے قابو ہوگئی لیکن یوسف کی طہارت قلب اس کے مقصد کی برآری میں مانع ہوئی۔ ایک روز اس نے خلوت کا فائدہ اٹھانا چاہا مگر یوسف بھاگ نکلے۔ اس نے دوڑایا اور کرتے کا جو دامن ہاتھ میں آیا وہ پھٹ گیا۔ یوسف

بھاگتے ہوئے اور وہ تعاقب کرتی ہوئی دروازے تک پہنچی، عزیز مصر کو دروازے پر کھڑا پایا تو پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی، فوراً سنبھلی اور بات بنائی کہ یوسف کی نیت خراب تھی اس لیے میں نے دوڑایا، یوسف اپنی صفائی دے رہے تھے اور وہ اپنی صفائی دے رہی تھی بالآخر عزیز مصر کی بیوی کے خاندان ہی کے ایک بوڑھے آدمی نے کہا کہ جب کرتا پھٹ گیا ہے تو مسئلہ کی تہہ تک پہنچنا دشوار نہیں۔

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ. وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ (یوسف/۲۶،۲۷)

اور اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے قرینہ کی شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کا کرتا آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی اور یہ سچا ہے۔

یہاں بھی دیکھیے دعویٰ اور دلیل میں ہم آہنگی کے لیے ''صدق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ الغرض ''صدق'' ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں ہر چیز کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سماج کے لیے کتنا اہم وصف ہے۔ سماج سے اگر صدق نکل جائے تو سماج اعتبار کے قابل نہیں رہ جائے گا۔ اسی لیے قرآن نے اسے ایمان کا بنیادی جز قرار دیا ہے۔ فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔ (الحجرات/۱۵)

مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہیں کیا اور انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

یہاں دعوائے ایمان کے مطابق اپنے عمل کو ڈھال لینے اور اپنے ظاہر کو اپنے باطن سے ہم رنگ کر دینے والوں کو ''صادقون'' کہا گیا ہے۔

صدق کی اس حقیقت اور اہمیت کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ اس وصف کا

مظاہرہ کرنے والوں کو آج کی نام نہاد تعلیم یافتہ دنیا بے وقوف اور غیر دانش مند قرار دیتی ہے جب کہ کذب کا سہارا لے کر واضح سے واضح حقیقت پر پردہ ڈال دینے والوں کو فن کار، ذہین اور کہنہ مشق سیاست داں قرار دیتی ہے۔ کذب کے اس سیلاب میں افسانہ حقیقت اور حقیقت افسانہ بنتی جارہی ہے۔ اسی جھوٹ کا سہارا لے کر افراد کی کردار کشی، جماعتوں کی اہانت، اداروں کی مخالفت اور ملکوں کو تاراج کرنے کا مذموم سلسلہ جاری ہے اور دنیا شدید اضطراب اور بے چینی کا شکار ہے۔

صبر

لفظ ''صبر'' کے اصل معنیٰ روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اس حقیقت نے کچھ زیادہ ہی پاکیزہ صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے اس کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۵۔

صبر کے اس مفہوم پر قرآن مجید کی یہ آیت واضح طور پر روشنی ڈالتی ہے:

وَالصَّابِرِيْنَ فِيْ الْبَأْسَاء والضَّرَّاء وَحِيْنَ الْبَأْسِ۔ (البقرہ/۱۷۷)	اور ثابت قدمی دکھاتے ہیں سختی میں، تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔

اس آیت میں ''البأ ساء'' سے مراد غربت ''الضراء'' سے مراد جسمانی بیماری اور ''البأ س'' سے مراد جنگ کی خوف ناکی ہے۔ گویا غربت، تنگ دستی اور جسمانی بیماریوں کو منشائے الٰہی سمجھ کر ان میں تحمل کا مظاہرہ کرنا اور حرف شکایت زبان پر نہ لانا و نیز میدان جنگ میں پامردی کا ثبوت دینا صبر ہے۔ اسی طرح موقف حق پر ڈٹے رہنے اور ہر قسم کی مداہنت سے یکسر گریز کرنے کے لیے بھی لفظ صبر کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُوْلُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (الاحقاف/۳۵)	سو موقف حق پر ڈٹے رہو جس طرح دوسرے اولوالعزم رسول ڈٹے رہے ہیں۔
وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُواْ عَلَى مَا كُذِّبُواْ۔ (الانعام/۳۴)	اور یقیناً تم سے پہلے کے بھی بہت سارے رسول جھٹلائے گئے لیکن انھوں نے اپنے جھٹلائے جانے کی پرواہ نہیں کی اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔

اگر ہمارے سماج میں صبر جیسی اخلاقی خوبی پیدا ہوجائے تو حق کو دبایا نہیں جاسکتا، اور نہ جانب داری کا چلن عام ہوسکے گا۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو بڑے بڑے سرہنگوں، سورماؤں اور سرپھروں کو اپنی کارروائی پر نظر ثانی کرنے اور ظلم واستحصال سے باز رہنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ ماضی میں چند افراد کی اس اخلاقی صفت نے بڑی بڑی جماعتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں مٹھی بھر جماعت نے اپنے اسی وصف کے بل بوتے پر ٹڈی دل فوج کو پیٹھ پھیر کر بھاگنے پر مجبور کردیا اور ان کے صبر نے ان کے زاویۂ فکر ونظر کو ہی تبدیل کردیا۔ قرآن کہتا ہے:

إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُواْ أَلْفاً مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لاَّ يَفْقَهُونَ۔ (الانفال/۶۵)	اگر تمھارے بیس ثابت قدم آدمی ہیں تو وہ دوسو پر بھاری ہوں گے اور اگر تمھارے سو ثابت قدم آدمی ہوں تو وہ کافروں کے ایک ہزار افراد پر بھاری ہوں گے کیونکہ یہ کافر لوگ صبر کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کی حقیقت کو اہل بصیرت ہی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ بصیرت سے محروم ہوتے ہیں وہ اس صبر کو درماندگی اور عجز و تذلل پر محمول کرتے ہیں۔ صبر کو درماندگی سمجھنے والے مواقع صبر پر جرأت کا مظاہرہ کرہی نہیں سکتے اور جن کے اندر جرأت نہ ہو وہ کبھی کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ صبر کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس کی تلقین بار بار کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْعَصْرِ. إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ. إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر)	زمانہ شاہد ہے کہ انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، حق کی وصیت اور صبر کی تلقین کی۔

''مجبوری کا نام صبر'' کا محاورہ، صبر کی حقیقت کو نہ سمجھ پانے والوں کا ہی ایجاد کردہ ہے۔

اعتدال

اعتدال درمیانی راہ کو کہتے ہیں، جس میں افراط ہو نہ تفریط۔ شاہراہ اعتدال پر قائم رہنے کے لیے جذباتیت، عجلت پسندی اور ناعاقبت اندیشی سے اجتناب لازم ہے، یہ اعتدال زندگی کے ہر شعبہ میں مطلوب ہے خواہ وہ عبادات کا شعبہ ہو یا معاملات کا، رفتار کا میدان ہو کہ گفتار کا، حتی کہ شریک حیات کے ساتھ محبت اور نفرت میں بھی اعتدال ضروری ہے۔

اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے طریق ہائے عبادت پر نظر ڈالی جائے تو وہاں افراط یا تفریط کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں کفار و مشرکین کے طریقۂ عبادت میں شور وغل اور بکاء و تصدیہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی جیسا کہ آج ہے جب کہ نصاریٰ کے طریقۂ عبادت میں شہر خموشاں کی خامشی نظر آتی تھی۔ اسلام آیا تو اس نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ نکالی چنانچہ نماز کے سلسلہ میں یہ ہدایت فرمائی:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ (بنی اسرائیل/۱۱۰)	اور اپنی نماز میں نہ تو آواز بہت تیز کرو اور نہ بہت پست بلکہ ان کے درمیان کی راہ اپناؤ۔

اسی طرح کی ہدایت روزہ کے سلسلہ میں بھی ملتی ہے:

عن عبدالله بن عمر قال: أخبر رسول الله ﷺ أنی أقول: والله لأصومن النهار ولأقومن الليل ماعشت فقلت له: قد قلته بأبی أنت و أمی قال: فانک لن تستطيع ذلک فصم و أفطر وقم و نم وصم من الشهر ثلاثة أيام فإن الحسنة بعشر امثالها وذلک مثل صيام الدهر قلت إنی اطيق أفضل من ذلک، قال : فصم يوما و افطر يومين، قلت: إنی اطيق أفضل من ذلک، قال: فصم يوما و أفطر يوما فذلک صيام داؤد عليه السلام وهو أفضل الصيام، فقلت: إنی اطيق افضل من ذلک، فقال النبی ﷺ لا افضل من ذلک۔ ۶

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ میں کہتا ہوں کہ ہمیشہ دن میں روزے رکھوں گا اور شب میں قیام کروں گا (اللہ کے رسول ﷺ نے اس سلسلہ میں مجھ سے دریافت فرمایا) تو میں نے عرض کیا کہ جی ہاں، اے اللہ کے رسول میں نے یہ بات کہی ہے میرے ماں باپ آپ پر فدا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے نباہ نہیں سکتے اس لیے روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، قیام بھی کرو اور سوؤ بھی، ایسا کرو کہ تم مہینے میں تین دن روزے رکھا کرو، تمھاری اس نیکی کا اجر تم کو دس گنا ملے گا اور یہ صیام دہر ہی کی طرح ہوجائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ روزے رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا: تو ایک دن روزہ رکھو دو دن افطار کرو، میں نے عرض کیا میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا: تو ایک دن روزہ رکھو، ایک دن افطار کرو، یہ صیام داؤدی ہے اور یہ افضل الصیام ہے۔ میں نے کہا، میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو نبی ﷺ نے فرمایا نہیں، اس سے زیادہ نہیں۔

خرچ کے سلسلہ میں بھی اسلام اعتدال کا ہی حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً۔ (بنی اسرائیل ۲۹)

نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا رکھو اور نہ بالکل ہی کھول دو کہ تم ملامت زدہ او ردر ماندہ ہوکر بیٹھ رہو۔

رفتار میں اعتدال کی تلقین کرتے ہوئے اللہ کے محبوب بندے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ۔ (لقمان/۱۹) اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔

اور اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

وَلاَ تَمْشِ فِیْ الأَرْضِ مَرَحاً۔ (بنی اسرائیل/۳۷) تم زمین میں اکڑ کر نہ چلو

الغرض اعتدال اور میانہ روی زندگی کے ہر شعبہ میں مطلوب ہے۔ اس اعتدال کے عام ہو جانے سے کسی کو اپنی حق تلفی کا اندیشہ نہیں رہتا اور نہ کسی کو تکلیف مالا یطاق اٹھانی پڑتی ہے۔ سماج کے اندر اگر اعتدال اور توازن پیدا ہو جائے تو سماج کے تمام افراد کو متوازن زندگی گزارنے کی عادت پڑ جائے گی پھر نہ تو الحاد سر اٹھا پائے گا اور نہ جوگ اور تصوف پھل پھول سکے گا۔ اس لیے کہ اساسی طور پر یہ سب نظام زندگی میں عدم توازن کے مظاہر ہیں۔

احسان

احسان کا مطلب ہے عمدہ برتاؤ، فیاضانہ سلوک، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، عفو و درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینا، خود اپنے حق سے کم پر راضی ہو جانا، احسان معاشرے کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ احسان سے سماج میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا ہوتی ہیں، اس سے محبت، شکر گزاری، عالی ظرفی، ایثار، اخلاص اور نصح و خیر خواہی کا مزاج بنتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَأَحْسِنُوَا إِنَّ اللّهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (البقرہ/۱۹۵) احسان کرو، یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

احسان عمل کا سب سے اونچا درجہ ہے، اپنی مفوضہ ذمہ داری کو ادا کرنا اطاعت ہے، لیکن اس اطاعت میں جذبۂ محبت، قلبی تعلق اور حسن کارکردگی شامل ہو جائے تو یہی اطاعت احسان بن جاتی ہے۔ قارون کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دوسروں پر ایک حبہ بھی صرف نہیں کرتا تھا لیکن یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی ورنہ اس کے گرد حواریوں کا

ہالہ نہ ہوتا، اس کے صرف میں احسان کی کارفرمائی نہیں ہوتی تھی بلکہ مفاد پرستی اور اپنی ذات کا تحفظ ہوتا تھا اس لیے اخیار بنی اسرائیل نے اسے احسان الٰہی کا حوالہ دے کر احسان کی تلقین کی اور کہا کہ:

أَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۔ (القصص/۷۷) — تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو جس طرح اللہ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے۔

یہ احسان گفتار میں بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً ۔ (البقرہ/۸۳) — اور لوگوں سے بھلی بات کہو۔

اسے ہم اپنی زبان میں خوش گفتاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ خوش گفتاری قلبی آمادگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ واضح رہے کہ تملق اور ستائش بے جا دوسری چیز ہے اور خوش گفتاری ایک بالکل دوسری چیز ہے۔

یہ احسان سلوک میں بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ سلوک کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی کہ:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناً ۔ (العنکبوت/۸) — اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ اچھے سلوک کی وصیت کی۔

اس احسان کو حسن سلوک کہا جاتا ہے۔

اور وصف کردار میں بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ. إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْناً بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ (النمل/۱۰،۱۱) — میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے، مگر یہ کہ کسی نے ظلم کیا ہو پھر اگر اس نے برائی کے بعد اسے بھلائی سے بدل لیا ہو تو میں بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

اس احسان کو حسن عمل کہتے ہیں، تو گویا ہر انسان سے خوش گفتاری، حسن سلوک اور حسن عمل سب مطلوب ہے۔ اب اگر سماج کا کوئی طبقہ بھی احسان کو اپنی زندگی میں اتار لے تو ناممکن ہے کہ اس کے دوسرے طبقات پر اس کے اچھے اثرات نہ پڑیں، کیونکہ ”ھل جزاء الاحسان إلا الاحسان“ انسانی مزاج کا خاصہ ہے۔

ایثار

یہ کردار ہر چند کہ بڑا عظیم کردار ہے لیکن اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اور اگر کوئی اس کردار کو اپنانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ہر اس شخص کے دل پر حکمرانی کرے گا جس کے ساتھ اس نے اس کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایثار کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کی ضروریات کی تکمیل کو ترجیح دے۔ دنیا کا کون سا شقی القلب ہوگا جو اس کردار سے متاثر نہ ہو۔ اشاعت اسلام کے اس عہد میں جب "یدخلون فی دین الله افواجا" کی کیفیت تھی، اس اخلاقی وصف اس کیفیت کو پیدا کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے انہی کی تعریف میں کہا تھا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (الحشر/۹)	اور یہ لوگ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں جب کہ وہ خود حاجت مند ہیں۔

ایفائے عہد

یعنی عہد پورا کرنا، جب کوئی شخص کسی کام کا عہد کرے تو اسے وہ کام پورا کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ اس عہد میں نیک نیتی شامل ہو، اس سے عزیمت کی راہ کھلتی ہے۔ اور اگر اس عہد کا تعلق کسی اور سے بھی ہے تو اس کے دل و دماغ پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَوْفُواْ بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً۔ (بنی اسرائیل/۳۴)	عہد پورا کرو، عہد کے بارے میں لازماً پرسش ہونی ہے۔

عہد کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ گھر کا ایک ذمہ دار گھر کو سنبھالنے کا عہد کرتا ہے تو اسے گھر کے امور و مسائل کو دیکھنے اور اہل خانہ کی ضروریات کی تکمیل کرنے کو اپنا فریضہ سمجھنا چاہیے۔ کسی ادارہ کا ذمہ دار ادارہ کی سربراہی کا عہد کرتا ہے تو اس کے نشیب و فراز سے اسے حسن و خوبی کے ساتھ گزرنا چاہیے اور اس کے نفع اور نقصان پر نظر رکھنی چاہیے۔ ایک امیر جماعت جب جماعت کی قیادت کا عہد لیتا ہے تو اسے بیدار قیادت کا ثبوت

دیتے ہوئے اس کے دائرہ اثر کو بڑھانے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ کسی صوبہ کا وزیر اعلیٰ جب وزارت علیا کا عہد لیتا ہے یا کسی ملک کا وزیر اعظم جب وزارت عظمیٰ کا عہد لیتا ہے تو اسے صوبہ یا ملک کی تعمیر وترقی کے جتن کرنے چاہئیں، تعمیری کاموں کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے اور تخریبی کارروائیوں کو بزور قوت روکنے کو یقینی بنانا چاہیے۔ اگر مختلف سطح کے یہ قائدین اپنی قیادت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے تو گویا وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بدعہدی کرتے ہیں۔

اس سے ذرا اور زیادہ وسیع تناظر میں دیکھیے تو ہر انسان کا ایک دوسرے کے ساتھ عہد ہوتا ہے، جس کو فطری عہد (Natural Contract) کہا جاتا ہے۔ جب ایک انسان کسی سماج میں آنکھیں کھولتا ہے تو اس کی قوت، صلاحیت اور مرتبے کے لحاظ سے اس سے سماج کے کچھ تقاضے وابستہ ہو جاتے ہیں جن کی تکمیل سماجی اصولوں کی رو سے لازمی ہو جاتی ہے۔ یہ تقاضے کئی ایک ہیں لیکن ہر سماجی کارکن سے سماج کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ وہ سماج کے لیے ایک مفید کل بنے، اسے فائدہ پہنچائے، اسے پہنچنے والے نقصان کو روکے، اور جو شخص سماج کے اس اہم تقاضہ کو پورا نہیں کرتا وہ عند اللہ مفسد ہے۔ فساد پھیلانا بھی افساد ہے اور فساد کو نہ روکنا بھی افساد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عہد شکنوں کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

الَّـذِيْـنَ يَـنْـقُـضُـونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِن بَعْدِ مِيْثَـاقِـهِ وَيَـقْـطَـعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُـوصَـلَ وَيُـفْسِـدُونَ فِـىْ الْأَرْضِ أُولَـئِـكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ۔ (البقرہ/۲۷)

جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں حقیقت میں یہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

ہمارے سماج میں ایفائے عہد کی خوبی پیدا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ سماج کے تمام فراد ایک دوسرے کے معاون بن جائیں گے بلکہ ایک دوسرے سے شکایات کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

استغناء

اس کے اصل معنیٰ بے نیازی کے ہیں۔ یعنی عیش وعشرت اور متاع جہاں کی طمع سے بے نیازی۔ جن لوگوں کو متاع استغناء میسر آ جاتی ہے وہ لوٹ مار اور رہزنی سے کوسوں دور اور بغض وحسد اور کینہ وکدورت سے پاک رہتے ہیں، پھر نہ انھیں سستی شہرت کی بھوک ہوتی ہے اور نہ دوسروں کی کمائی پر ڈاکہ ڈال کر بہت جلد مال دار ہو جانے کی تمنا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ محنت کش ہوتے ہیں اور اپنی محنت کا جو پھل پاتے ہیں اس پر خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی عزت وسرفرازی بھی داغ دار نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے استغناء کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى۔ (طٰہٰ/۱۳۱)

اور تم نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اس شان وشوکت کی طرف جو ہم نے ان میں سے بہتوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے آزمانے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق ہی بہتر اور پائیدار ہے۔

سخاوت

انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ وہ اپنے تمام بندوں کو نوازتا ہے خواہ وہ فرماں بردار ہوں یا نافرمان۔ جب مال کا مالک حقیقی بخل سے کام نہیں لیتا تو جن کو اس نے نوازا ہے وہ بخیلی کیوں دکھائیں؟ جب کہ اس نے یہ خوش خبری بھی دی ہے کہ اگر ہمارے عطا کردہ مال کو ہماری ہدایت کے مطابق دوسروں پر خرچ کرو گے تو ہم اسے اور بڑھائیں گے۔ فرمایا:

مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافاً كَثِيرَةً وَاللّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (البقرہ/۲۴۵)

کون ہے جو اللہ کو قرض دے کہ وہ اسے کئی گنا اور بڑھا کر واپس کرے۔ اللہ ہی گھٹاتا بھی ہے اور وہی بڑھاتا بھی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے بھی جاؤ گے۔

سخاوت اور فیاضی سے قلب میں کشادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور اس سے سائلوں اور محروموں کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ اگر سماج میں یہ اخلاقی وصف پیدا ہوجائے تو سرمایہ داروں کو تحفظ بھی فراہم ہوگا اور پڑوس میں کوئی غریب اور مفلس غربت و افلاس سے دم توڑتا بھی نظر نہیں آئے گا۔

تحمل

تحمل بردباری اور برداشت کو کہتے ہیں اور حقیقی تحمل یہ ہے کہ ایک شخص پر دوسرا زیادتی کررہا ہے اور وہ اس سے انتقام لینے کی قوت رکھتا ہے پھر اس زیادتی کو جھیل جائے، اس سے انتقام نہ لے، اس عمل کی قدروقیمت اللہ کے نزدیک بھی بہت ہے اور ایک اچھے سماج میں بھی بہت ہے۔ اس کردار کا مظاہرہ کرنے والا بظاہر اپنے لیے مصیبت مول لیتا ہے لیکن فی الواقع وہ اس کے ذریعہ اللہ کی رحمت کو اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ۔ (النور/۲۲)

انھیں معاف کرنا چاہیے اور درگزر سے کام لینا چاہیے کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں معاف کردے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ۔ (البقرہ/۲۶۳)

بھلی بات اور درگزر صدقہ سے بہتر ہے۔

اس کردار سے سماج ٹوٹنے اور بکھرنے سے محفوظ ہوتا ہے اور جب سماج میں بکھراؤ نہ ہوتو اخذ وقبول کی راہ ہموار ہوگی۔ اس طرح پیغام حق پہنچانے میں بڑی مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے تحمل کی بڑی تعریف کی ہے اور اس تحمل کی حکمت واضح کرتے ہوئے مزید تحمل کا ثبوت دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔ (آل عمران/۱۵۹)

تم اللہ کی رحمت سے ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو اور اگر تم تند خو اور سنگ دل واقع ہوئے ہوتے تو یہ سب تمھارے پاس سے چھنٹ جاتے، اس لیے ان کے قصور معاف کردو اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرو۔

عدل

عدل انصاف کو کہتے ہیں۔ اگر کسی سماج میں ساری اخلاقی خوبیاں ہوں صرف عدل نہ ہو تو اس سماج کو شکست و ریخت سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اس وقت پوری دنیا میں جس اخلاقی وصف کی سب سے زیادہ کمی ہے وہ یہی عدل ہے۔ اور عدل کی کمی کے دو اہم اسباب ہیں:

۱- ذاتی مفادات کا رجحان عام ہو گیا ہے اور زندگی کا مقصد ذات رہ گیا ہے۔

۲- عدل کو مساوات کا ہم معنیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لیے عدل کے نام پر اگر کہیں کچھ کوششیں نظر بھی آ رہی ہیں تو وہ روح سے خالی ہونے کی وجہ سے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی ہیں۔

مساوات یہ ہے کہ سب کو یکساں حیثیت اور اہمیت حاصل ہو اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا حصول محال ہے۔ عدل یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی اہمیت اور حیثیت کے لحاظ سے اس کی جگہ ملے۔ عدل اسلامی تصور ہے اور مبنی بر فطرت ہے جب کہ مصنوعی مساوات ایک غیر اسلامی تصور ہے اور یہ خلاف فطرت ہے۔ کسی بھی نظام کے تمام افراد کے ساتھ جب تک عادلانہ برتاؤ نہ ہو نظام کی کامیابی کی امید عبث ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى۔ (المائدہ/۸)

عدل کرو یہ تقوی سے قریب تر ہے۔

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ النساء/۵۸)

اور تم جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔ (المائدہ/۴۲)

اور اگر لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

انکسار

یہ تکبر کی ضد ہے۔ تکبر کے معنیٰ ہیں اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے اونچا قرار دینا اور اپنے بڑے ہونے کا احساس واظہار کرنا اور انکسار کے معنیٰ ہیں خود کو چھوٹا جتانا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اتنا چھوٹا بنالیا جائے کہ حیثیت عرفی ہی ختم ہوجائے۔ بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اپنی حیثیت اور مقام کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے منصب اور مرتبہ پر اترانے کے بجائے عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا۔ (الفرقان/۶۳)

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی اور فروتنی سے چلتے ہیں۔

اب غور کیجیے کہ کیا ہمارے موجودہ انسانی سماج میں لوگوں کے قول وعمل اور ظاہر وباطن میں مطابقت ہے؟ کیا ہم نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر موقف حق پر ڈٹنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ کیا ہم افراط وتفریط سے مجتنب اور شاہ راہ اعتدال پر قائم ہیں؟ کیا ہم نیک برتاؤ، فیاضانہ سلوک، ہمدردانہ رویے، رواداری، خوش خلقی، صفح ودرگزر اور باہمی مراعات کی روش پر قائم ہیں؟ کیا ہم اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے ہیں؟ کیا ہم کسی ذمہ داری کو اٹھا لینے کے بعد اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں؟ کیا عیش وعشرت سے بے نیازی ہمارے اندر پائی جاتی ہے؟ کیا ہمارے پڑوس کا فاقہ کش ہمارے مال سے مستفید ہو رہا ہے؟ کیا ہم کسی زیادتی کرنے والے کو قوت انتقام رکھنے کے باوجود معاف کرتے ہیں؟ کیا ہم مختلف سطحوں پر عدل کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟ اور کیا ہم اپنے آپ کو اللہ سے چھوٹا اور کائنات کی تمام مخلوقات سے بڑا سمجھ کر صرف اللہ کے آگے جھکتے ہوئے تمام آستانوں اور استھانوں پر جبہ سائی سے گریزاں ہیں؟ اور اگر نہیں تو ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اخلاقی انحطاط اس دور کا سب سے بڑا اور سب سے سنگین مسئلہ ہے۔

غیر متوازن نظام تمدن

دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان آباد ہیں وہ اجتماعی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ اجتماعی زندگی نہ صرف یہ کہ ان کے لیے باعث خیر و برکت ہے بلکہ یہ ان کی ناگزیر ضرورت بھی ہے۔ ہر انسان اگرچہ اپنے وجود کے لحاظ سے ایک مکمل ہستی ہے لیکن وہ اپنی بقا کے لیے متعدد سہاروں کا محتاج ہے۔ مثلاً تکمیل خواہش اور بقائے نسل کے لیے اسے اپنے جوڑے کی ضرورت ہے۔ زندہ رہنے کے لیے آگ، ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔ ستر پوشی اور زینت کے لیے لباس کی ضرورت ہے۔ کسب معاش کے لیے بے شمار وسائل کی ضرورت ہے اور ان تمام چیزوں کا حصول ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی فطرت اجتماعیت کی محتاج ہے۔ اس اجتماعیت کا تقاضا ہے کہ اس کے افراد میں فرق مراتب ہوتا کہ اجتماعی نظام بغیر کسی تصادم کے قائم رہ سکے۔ لیکن یہ فرق مراتب صلاحیتوں اور کارکردگیوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ جس شخص کے اندر جو صلاحیت ہو، اجتماع کو اس کی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسی میں پورے اجتماع کی فلاح ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماضی میں اجتماعیت کی جو دو کریہہ شکلیں وجود میں آئیں یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت ان سے تمدن کا سارا نظام ہی بگڑ گیا۔ کیونکہ سرمایہ داری سے فرد حد مناسب سے زیادہ آزاد ہوگیا اور اس نے خاندان اور سماج پر بے انتہا ظلم ڈھائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس ظلم سے چھٹکارا پانے کے لیے ہر شخص کا مرکز فکر اور محور عمل حصول سرمایہ بن گیا اور اشتراکیت سے حکومت و ریاست اتنی با اختیار ہوگی کہ فرد کا تشخص ہی ختم ہوگیا۔ اب اس کی حیثیت حکومتی و ریاستی مشین کے ایک بے روح پرزے سے زیادہ نہیں رہ گئی۔

اس وقت پوری دنیا میں عملاً یہی دونوں نظام رائج ہیں۔ اس لیے پورا نظام ہی غیر متوازن ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کسی کا خیال یہ ہو کہ اب تو ایک نظام دم توڑ چکا ہے اس لیے رائج نظام کی حیثیت سے اس کا ذکر نہیں ہونا چاہیے لیکن میں اس بات سے اتفاق نہیں

کرتا۔ وہ نظام فیل ضرور ہوگیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا ہے۔ اب بھی اس کی کارفرمائی دنیا کے مختلف حصوں میں ویسے ہی ہے جیسے چند سالوں پہلے تھی۔

اس عدم توازن کا ایک الم ناک پہلو یہ ہے کہ سرمایہ دار افراد کی سرمایہ داری میں اور غریب افراد کی غربت ہی میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اسی عدم توازن کا نتیجہ ہے کہ سماجی تفاوت اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ایک امیر کا لڑکا انتہائی عیش و تنعم کی زندگی گزارتا، عمدہ سے عمدہ چیزیں کھاتا، موسم کے لحاظ سے بہترین سے بہترین لباس زیب تن کرتا اور داد عیش دیتا ہے اور اسی کے پڑوس میں ایک غریب کا لڑکا پھٹے پرانے لباس پہنے ہوئے موسم کی سختیوں کو جھیلتا اور کچڑادان سے دانہ چگ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے پر مجبور ہے۔

معاشی نظام کی ناہمواری اور معاشی لحاظ سے زمین و آسمان کا یہ تفاوت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس کا اگر کوئی سنجیدہ حل نہ نکالا گیا تو ایک طبقہ پھیل کر آفتاب اور دوسرا سمٹ کر ذرہ بن جائے گا اور پوری دنیا ایک ایسے اضطراب میں مبتلا ہو جائے گی جس کا لازمی نتیجہ بغاوت ہوتا ہے اور اگر ہمہ گیر بغاوت کا سیلاب آگیا تو فرد واجتماع کی یہ کشاکش پورے سماج کو پارہ پارہ کردے گی۔ پھر یہ سماج انسانی سماج کے بجائے جانوروں کا گلہ بن کررہ جائے گا۔ اس صورت حال پر تشویش تو ہونے لگی ہے اور اب انسانوں کا بڑا طبقہ اس کا حل بھی تلاش کرنے لگا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ حل تلاش کرنے والوں کی نظر پچاس ہزار سال پہلے کے احوال پر تو پڑ رہی ہے جس کا کوئی مستند تاریخی ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن محض چودہ سو سال پہلے کے اس سماج پر نہیں پڑ رہی ہے جس کی مکمل تاریخ محفوظ ہے اور جس کا کامیاب تجربہ بھی کیا جاچکا ہے اور جس کا ذکر مسلم اور غیر مسلم سارے تاریخ نویسوں اور سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ دنیا نے اس عہد کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والوں نے اس نظام تمدن کی برکتوں سے فائدہ اٹھا کر قوموں، ملکوں اور ملتوں کی کامیاب امامت وقیادت کی ہے۔

زیادہ تعجب ان پر نہیں ہے جن کی آنکھوں پر دوسرے فکر کی خاص خاص رنگوں کی عینک لگی ہوئی ہے بلکہ زیادہ حیرت ان پر ہے جو شب و روز اس نظام کی دہائی دیتے، اس کی

وکالت کرتے اور اسے دنیا کا سب سے بہترین نظام تمدن قرار دیتے ہوئے نہیں تھکتے۔

آج پوری دنیا میں پچاس سے زائد ایسے ممالک ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں مختلف قسم کے قدرتی وسائل سے مالا مال بھی کیا ہے جن کا اگر وہ دانش مندانہ استعمال کریں تو ساری دنیا ان کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ان حکومتوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ اس نظام کو نافذ کرنے میں خدشات ہیں اس لیے انھیں تامل ہو رہا ہے تو جس طرح مختلف سطحوں کے وفاق بنتے اور سب اپنے اجتماعی کردار کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً ایشیائی ممالک کا وفاق، سارک ممالک کا وفاق، ترقی یافتہ ملکوں کا وفاق، ترقی پذیر ملکوں کا وفاق اور خود اسلامی ممالک کا بھی ایک وفاق موجود ہے۔ اسی طرح کا ایک وفاق بنایا جا سکتا ہے یا اسی اسلامی ممالک کے وفاق کو متحرک اور فعال بنا کر اس وفاق میں اس نظام تمدن کو نافذ کر کے دنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ بے شک اس میں رکاوٹیں ڈالی جائیں گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کام ہی ناممکن ہو جائے گا، بس فکر اور جرأت کی ضرورت ہے۔

متوازن نظام تمدن

ایک متوازن نظام تمدن کے لیے ضروری ہے کہ فرد اور اجتماع دونوں کے حدود و اختیارات متعین ہوں اور دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں مناسب آزادی حاصل ہو۔

فرد کے حدود و اختیارات

ہر فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے مواقع ملنے چاہیے تاکہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا آزادانہ استعمال کر سکے۔ البتہ ساتھ ہی فرد کو یہ احساس بھی دلانے کی ضرورت ہے کہ حدود و اختیارات کا صحیح استعمال ہونا چاہیے تاکہ احتساب کی گھڑی مشکل نہ ہو جائے۔ حدود و اختیارات دنیا میں ملتے ہیں اور احتساب قیامت کے دن ہوگا۔ اور اسے اس بات کی بھی تذکیر ہونی چاہیے کہ جس طرح وہ اپنے حدود و اختیارات میں پوری طرح آزاد تھا اسی طرح جواب دہی بھی اس کو تنہا ہی کرنی ہوگی۔

وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْداً۔ (مریم/۹۵)
اور ان میں سے ہر ایک اللہ کے حضور تنہا حاضر ہوگا۔

وہاں اس سے اس کی انفرادی زندگی کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً۔ (الملک/۲)
جس نے موت اور حیات کا سلسلہ اس لیے جاری کیا کہ تمھارا امتحان لے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے۔

اور اس کی اجتماعی زندگی کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلائِفَ الأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَا آتَاکُمْ۔ (الانعام/۱۶۵)
اور وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کا درجہ بعض سے اونچا کیا تا کہ تم کو آزمائے ان تمام چیزوں میں جو اس نے تم کو دیے ہیں۔

قرآن نے اسے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ ہر شخص کا اپنا عمل ہی قیامت کے روز اس کے کام آئے گا۔ وہاں دوسروں کا سہارا نہیں ہوگا۔

أَمْ لَمْ یُنَبَّأْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوسَی. وَإِبْرَاھِیْمَ الَّذِیْ وَفَّی. أَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِزْرَ أُخْرَی. وَأَن لَّیْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَی. وَأَنَّ سَعْیَهُ سَوْفَ یُرَی. ثُمَّ یُجْزَاہُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَی۔ (النجم/۳۶-۴۱)
اور کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہ جو اس نے سعی کی اور یہ کہ اس کی سعی کا عنقریب جائزہ لیا جائے گا پھر اسے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اجتماع کے حدود و اختیارات

اجتماع افراد کے مجموعہ سے بنتا ہے۔ افراد کم ہوتے ہیں تو اجتماع چھوٹا ہوتا ہے اور جب اجتماع چھوٹا ہوتا ہے تو اس کے تقاضے بھی کم ہوتے ہیں، لیکن جب افراد زیادہ ہوتے ہیں تو اجتماع بڑا ہوتا ہے اور جب اجتماع بڑا ہوتا ہے تو اس کے تقاضے بھی زیادہ

ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اجتماع چھوٹا ہو یا بڑا اس کے تمام افراد کی انفرادی ذمہ داریوں کے ساتھ ہر ایک کی کچھ اجتماعی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اور ان اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک اجتماعی نظام نہ ہو، ایک سربراہ اعلیٰ نہ ہو، افراد اجتماع کی تعلیم وتربیت کا اجتماعی نظم نہ ہو، مادی ترقیات کے لیے اجتماعی سعی و جہد نہ ہو، اسی کے ساتھ روحانی تربیت کا انتظام نہ ہو، ایک باقاعدہ سیاسی ڈھانچہ نہ ہو، عدلیہ کا قیام عمل میں نہ آئے، کوئی مقننہ نہ ہو اور سارے لوگ اس اجتماعی نظام کے کل پرزے نہ بن جائیں اور ان تمام انتظامات و اہتمامات میں باہمی اخوت، ہمدردی اور محبت کی کارفرمائی ناگزیر ہے۔ یعنی کیفیت یہ ہو جائے کہ:

اَلْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ۔ (التوبۃ/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہوتے ہیں۔

اور اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے اجتماع کے تمام افراد سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

کونوا عباداللہ إخوانا۔[۷]

اے اللہ کے بندو! تم ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔

اس اجتماع کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کے تمام افراد خواہ وہ امیر ہوں یا مامور سب ایک دوسرے کے بہی خواہ اور ہمدرد ہوں۔ حضرت تمیم داری سے روایت ہے:

قال رسول اللہ ﷺ: إن الدين النصيحة، إن الدين النصيحة، إن الدين النصيحة، قالوا لمن يا رسول اللہ قال للہ و كتابه ورسوله وأئمة المومنين وعامتهم۔[۸]

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے، دین خیر خواہی کا نام ہے، دین خیر خواہی کا نام ہے، لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کس کی خیر خواہی، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مومنوں کے ائمہ کی اور عام مومنین کی۔

صالح اجتماع کا امیر من مانی نہیں کرتا اور نہ اپنے رائے اور فیصلے کو لوگوں پر تھوپتا ہے بلکہ وہ تمام اہم امور میں فیصلے باہمی مشورے سے کرتا ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ ۔ (الشوریٰ/۳۸)	اور ان کے امور باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

چونکہ اس اجتماع میں سب کی شمولیت اور شراکت ہوتی ہے اس لیے فیصلوں میں اجتماعی مصالح بھی پیش نظر ہوتے ہیں۔

اس متوازن نظام تمدن کو قائم اور برپا کرنے کی اصل ذمہ داری مسلمانوں کی ہے کیونکہ ان کے پاس خالق کائنات کا بنایا ہوا ایک ایسا نظام تمدن موجود ہے جس کا کامیاب تجربہ عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد خلفائے راشدین میں کیا جاچکا ہے۔ مسلمانوں کے اسی امتیاز واختصاص کی وجہ سے انھیں خیر امت کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۔ (آل عمران/۱۱۰)	تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۔ (البقرہ/۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر دین حق کے گواہ بن کر رہو۔
كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۔ (المائدہ/۸)	تم اللہ کے لیے عدل کے گواہ بن کر کھڑے ہونے والے ہو جاؤ۔

ان خطوط پر جب ایک اجتماعی نظام قائم ہو جاتا ہے تو اس کی برکتیں آپ سے آپ ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ پھر نہ کوئی مال دار مار گنج بن پاتا ہے اور نہ کوئی غریب افلاس کی اس سطح پر آجاتا ہے جو فی الواقع کوئی سطح نہیں۔ کیوں کہ اس نظام تمدن کے ہر فرد کے سامنے یہ خدائی حکم ہوتا ہے کہ:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقْنَاکُم مِّن قَبْلِ أَن یَأْتِیَ یَوْمٌ لاَّ بَیْعٌ فِیهِ وَلاَ خُلَّةٌ وَلاَ شَفَاعَةٌ۔ (البقرہ/۲۵۴)	ایمان لانے والو! جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ ہی شفاعت سے کام چلے گا۔
یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِن طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَکُم مِّنَ الأَرْضِ۔ (البقرہ/۲۶۷)	اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ خرچ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے مالوں پر جو زکوٰۃ عائد کی ہے اسے وصول کر کے اہل ایمان کو پاک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ فرمایا:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَکِّیهِم بِهَا۔ (التوبہ/۱۰۳)	اے نبی! تم ان کے مالوں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور انھیں نیکی کی راہ میں بڑھاؤ۔

جس نظام تمدن میں انفاق ذریعۂ تطہیر قرار پاجائے اس نظام کے انفاق کی کیفیت اور اس سے ظاہر ہونے والی برکتیں محتاج تفصیل نہیں ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مال داروں سے لیے جانے والے مال کا مصرف ہی یہ بتایا ہے کہ:

توخذ من اغنیائهم و ترد إلی فقرائهم۔[9]	مال داروں سے زکوٰۃ لی جائے اور انھی کے غریبوں میں تقسیم کردی جائے۔

اگر یہ نظام تمدن رائج ہوجائے تو جس غریبی کو آج دنیا بہت بڑے مسئلہ کی شکل میں دیکھ رہی ہے اور جس کے خاتمے کے لیے روز قانون پر قانون بن رہے ہیں لیکن غریبی ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے وہ غریبی دنیا سے تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہوسکتی ہے اور بالخصوص اس عہد میں جب کہ وسائل کی غیر معمولی فراوانی ہے۔ موجودہ رائج نظام تمدن ایک فاسد نظام تمدن ہے اور یہ اس عہد کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس کی جگہ متوازن نظام تمدن کی تاسیس وقت کی بڑی ضرورت ہے۔

نظام معاش کی ناہمواری

روٹی، کپڑا اور مکان انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور ان کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا ہر شخص کا فطری حق ہے۔ اس لیے حصول رزق کی کاوشوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور حصول معاش کی راہ میں آنے والی غیر فطری رکاوٹوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے خود تلاش معاش کی ترغیب دی ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔ (الاعراف/۱۰)	اور یقیناً ہم نے زمین میں تمھیں اقتدار بخشا ہے اور اس میں تمھارے لیے سامان معاش رکھ دیے۔
هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ۔ (الملک/۱۵)	وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے تابع کیا تو اس کے کناروں پر چلو اور اس کا رزق کھاؤ۔

روٹی، کپڑا اور مکان کی بنیادی ضرورت کا فطری حق صرف کسی ایک طبقہ کا نہیں بلکہ سب کا ہے۔ اس لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ تمام انسانوں کے لیے یکساں طور سے حصول رزق کے امکانات روشن رہیں، لیکن موجودہ عالمی نظام معاش نے کچھ لوگوں کے لیے تو راہیں بڑی کشادہ کردی ہیں اور کچھ لوگوں کے لیے اتنی دشواریاں پیدا کردی ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے رزق کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ اب ان کے لیے یا تو فقر و فاقہ ہے یا تو خیرات کی روٹی یا پھر کاسہ لیسی۔

موجودہ معاشی نظام کی اس ناہمواری کو باقی رکھنے بلکہ فروغ دینے میں جتنا ہاتھ خدا بیزار قوتوں کا ہے اتنا ہی ان لوگوں کا بھی ہے جن کی دین داری بظاہر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس وقت جو معاشی تصورات عام طور پر رائج ہیں اور جنھوں نے علم معیشت میں مال، اس کے حصول، حصول کے ذرائع اور ذخیرہ اندوزی کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ خود انسان، اس کے احساسات، مفادات اور اقدار سب نظر انداز ہوگئے ہیں۔

عالمی معاشی نظام کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت چھ معاشی نظریات رائج ہیں:

پہلا نظریہ

یہ نظریہ ترک دنیا کے قائلین کا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ فقر و فاقہ کوئی ایسی برائی نہیں ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی فکر کی جائے اور نہ یہ کوئی ایسا مسئلہ ہے جو حل طلب ہو، بلکہ یہ ایک نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو نوازتا ہے تاکہ آخرت کا تصور ان کے دل پر ہمیشہ نقش رہے اور وہ دنیا سے بے تعلق ہو کر یاد الٰہی میں منہمک رہیں۔ اس کے برعکس خوش حالی اور دولت مندی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خدا سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے[۱۰]۔

ان تارکین دنیا میں ایک طبقہ برادران وطن کا بھی ہے اور ایک طبقہ مسلمانوں کے اندر کا بھی۔ اور اس باب میں دونوں کے نظریات تقریباً یکساں ہیں۔ ان دونوں طبقات سے تعلق رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ کلفت اور نفس کشی، عسرت اور تنگ دستی روحانی ارتقا کا وسیلہ ہیں۔

دوسرا نظریہ

دوسرا نظریہ جبریہ کا ہے جو کہتا ہے کہ فقیر کی عسرت و تنگ دستی اور دولت مند کی ثروت اور خوش حالی میں اللہ کی مشیت کارفرما ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو سب کو دولت مند کر دیتا لیکن وہ کسی کو رزق فراواں دیتا ہے تو کسی کو بالکل کم تاکہ وہ اس طرح سے لوگوں کو آزمائے[۱۱]۔

جبریہ کا نظریہ صرف مشیت الٰہی کی کارفرمائی تک محدود ہوتا تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں تھی لیکن یہ فقیروں اور تنگ دستوں کو اس بات کی جو تلقین کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس سے بڑھ کر نہ مانگو اور نہ اپنی فقر و مسکنت کو بدلنے کی کوشش کرو۔ اس طرح اس تصور نے ایک خطرناک نظریہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

تیسرا نظریہ

یہ نظریہ سرمایہ داروں کا ہے جو کہتے ہیں کہ فقر و فاقہ کی زندگی برائیوں میں سے ایک برائی اور مسائل حیات میں سے ایک مسئلہ تو ضرور ہے مگر اس برائی کے ذمہ دار یا تو خود نادار لوگ ہیں یا پھر تقدیر الٰہی، سوسائٹی یا حکومت اس کی ذمہ دار نہیں۔ ہر شخص اپنی ذات کا خود کفیل ہے اور ہر ایک اپنے مال کو خرچ کرنے میں بالکل آزاد۔ کسی کو محنت و کوشش کرکے مال دار بن جانے سے کوئی نہیں روکتا۔ حصول زر کی اس دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے سوسائٹی اس کی بالکل ذمہ دار نہیں اور دولت مند لوگ اس بات کے بھی مکلّف نہیں کہ اس کی مدد کریں۔

چوتھا نظریہ

یہ نظریہ مارکسی اشتراکیت کے علم برداروں کا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ فقر و محتاجی کا خاتمہ اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب دولت مند طبقہ کا بالکل خاتمہ کردیا جائے اور ان کے مال و دولت کو ضبط کرلیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سوسائٹی میں مختلف طبقوں کو دولت مند طبقہ کے خلاف بھڑکانا اور ان کے دلوں میں سرمایہ داروں کے خلاف حسد اور کینہ کا بیج بونا اور طبقاتی کشمکش کو ہوا دینا بہت ضروری ہے تاکہ مزدوروں کا طبقہ جسے ''پرولتاری'' کہا جاتا ہے غالب آجائے۔ اس نظریہ کے علم بردار دولت مند طبقے کے خاتمہ پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ذاتی ملکیت کے بھی خلاف ہیں اور پیدائش دولت کے سب ذرائع مثلاً زمین، کارخانے اور مشینوں وغیرہ کو حکومت کی تحویل میں دے دینے کے حامی ہیں[۱۳]۔

یہ نظریہ، نظریۂ سرماداری کا ردعمل معلوم ہوتا ہے اور جب کوئی چیز ردعمل کے طور پر وجود میں آتی ہے تو وہ زیادہ غیر متوازن ہوتی ہے۔ اسی لیے اس نظریہ کے حاملین لادینی ریاست کا قیام چاہتے اور جبر و تشدد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

پانچواں نظریہ

یہ گلوبلائزیشن کا نظریہ ہے اور یہ درحقیقت سرمایہ دارانہ نجی معیشت کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ بھی زندگی سے خدا کی بے دخلی پر مبنی ہے۔ گلوبلائزیشن کا نظریہ یہ چاہتا ہے کہ ایک ایسا نظام پوری دنیا میں رائج ہو جس سے ہر چیز خریدنی وفروختنی بن جائے۔ حتیٰ کہ قدرت نے جو چیزیں وافر مقدار میں فراہم کی ہیں ان پر بھی تسلط حاصل کر کے اپنا کاروبار چلایا جائے اور اس سے زیادہ سے زیادہ سرمایہ حاصل کیا جائے۔

یہ نظریہ دوسرے تمام نظریات سے زیادہ خطرناک نظریہ ہے کیوں کہ اس کے عام ہو جانے اور عالمی منڈی پر پوری طرح چھا جانے کے بعد اندیشہ یہ ہے کہ پہلے مسائل پیدا کیے جائیں گے پھر ان مسائل کے حل کے بہانے سرمایہ حاصل کیا جائے، چنانچہ اس نے اپنے پر پرزے ابھی سے پھیلانے شروع کر دیے ہیں اور ہمارے ملک ہندوستان میں جہاں یہ نظریہ مقبول ہو رہا ہے اس کی حکومت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ''اشیائے ضروریہ پر سے سبسڈی ختم کر دی جائے اس لیے کہ یہ معاشی کارکردگی (Efficiency) کے خلاف ہے۔ جس کے پاس ہندوستان میں پیسہ نہ ہو وہ کوکنگ گیس کیوں خریدے؟ اگر وہ غریب ہو تو شکر کیوں استعمال کرے؟ اپنے گھر میں مٹی کے تیل کا چراغ کیوں جلائے؟ اس طرح تو حکومت کے خزانے پر بہت بار پڑتا ہے''[۱۴]۔

چھٹا نظریہ

یہ نظریہ اسلام کا ہے۔ یہ ترکِ دنیا کے تصور کو بھی غلط قرار دیتا ہے، مشیت الٰہی مان کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کو بھی درست نہیں سمجھتا، فقر و فاقہ کو فقیروں اور فاقہ کشوں کی لازمی کوتاہی نہیں مانتا، لادینی ریاست کے قیام اور جبر و تشدد کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور سرمایہ دارانہ نجی معیشت کے احیا کا بھی حامی نہیں ہے۔ بلکہ وہ حصول دولت کی کاوش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اسے ضرورت کے مطابق بے تکلف خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ البتہ حصول دولت کے جائز اور ناجائز طریقوں کی نشان دہی کرتے

ہوئے جائز طریقوں کو اپنانے اور ناجائز طریقوں سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ناجائز طریقوں کو اپنانے کی صورت میں سخت سزا کی وعید سناتا ہے۔ اسی طرح استعمال دولت کے صحیح طریقوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔[15]

ان تمام نظریات میں صرف اسلامی نظریۂ معاش ایسا ہے جو سماج کے امن و سکون کی ضمانت دیتا ہے، باقی تمام نظریات سماج کے امن وسکون کو غارت کرنے والے اور اضطراب اور بے چینی کو ہوا دینے والے ہیں۔ یہ سارے نظریات غلط اور باطل ہیں۔

باطل معاشی نظریات کے نقصانات

معاشی نظام کی اس ناہمواری نے انسانوں اور انسانوں کے معیار زندگی میں اتنا تفاوت پیدا کر دیا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ سارے انسان ایک ہی مخلوق ہیں۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ الگ الگ مخلوقات ہیں جن میں محض جسمانی ساخت کی یکسانیت ہے اور بس۔ اسلام سے پہلے بھی تقریباً یہی صورت حال تھی۔ یہ ایک ایسا عالمی مسئلہ ہے جس کا فوری حل نکالنا ناگزیر ہے ورنہ انسانوں کی انسانیت بالکل مردہ ہوجائے گی اور ان کا اختصاص و امتیاز بالکل ختم ہوجائے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام کے خطرناک نتائج سامنے ہونے کے باوجود اس مسئلہ پر نہ صرف یہ کہ سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک بڑا طبقہ مسئلہ ماننے کو ہی تیار نہیں ہے، اگر یہی صورت حال رہی تو اس سے بھی بڑی تباہی کا اندیشہ ہے۔ اس لیے اسلامی نظریۂ معاش کی طرف فی الفور توجہ کی ضرورت ہے۔

اسلام کا نظریۂ معاش

اسلام نے حصول دولت کی ترغیب دی ہے اور دنیا کے ساز و سامان کو استعمال کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ حکم بھی دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوا مِن رِّزْقِهِ۔ (الملک/۱۵)	وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے تابع کیا ہے تو چلو اس کے کناروں پر اور اس کا رزق کھاؤ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللّٰهِ۔ (البقرہ/۶۰)	کھاؤ اور پیو اللہ کے دیے ہوئے رزق سے۔
أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعاً لَّكُمْ۔ (المائدہ/۹۶)	تمھارے لیے سمندری جانوروں کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے، تمھارے سامان زیست کے طور پر۔
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّن بُيُوتِكُمْ سَكَناً وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتاً تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثاً وَمَتَاعاً إِلَىٰ حِينٍ۔ (النحل/۸۰)	اور اللہ نے تمھارے گھروں کو تمھارے لیے جائے سکون بنایا اور جانوروں کی کھالوں سے تمھارے لیے ایسے مکان بنائے جنھیں تم سفر اور قیام دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو اور اس نے جانوروں کے صوف، اون اور بالوں سے تمھارے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کیں جو زندگی کی مدت مقررہ تک تمھارے کام آتی ہیں۔

معلوم نہیں کہاں سے اسلام کا نام لینے والوں نے بھی ''توکل علی اللہ'' کا سہارا لے کر لوگوں کو یہ تلقین کرنی شروع کردی کہ رازق اللہ ہے اس کی رزاقی پر بھروسہ کرو وہ تمھیں بھوکا نہیں رکھے گا۔ اس کے لیے خواہ مخواہ بہت زیادہ ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت نہیں۔ اس تلقین کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ تلاش معاش کی فکر سے آزاد ہوگیا۔ اب یا تو وہ باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کو خرچ کرکے اپنی زندگی کی گاڑی کو گھسیٹ رہا ہے یا پھر صدقہ و خیرات پر انحصار کرکے دوسرے حق داروں کا حق مارتا اور سماج کے فطری نظام میں خلل انداز ہورہا ہے۔ حالانکہ قرآن نے بہت صاف لفظوں میں تلاش معاش کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ۔ (الجمعۃ/۱۰)	پس جب نماز ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اللہ تعالیٰ نے تلاش معاش کے لیے زمین میں چلنے پھرنے اور ہاتھ پیر مارنے والوں کا ذکر مجاہدین کے ساتھ کر کے تلاش معاش کے لیے جدو جہد کی اہمیت کا سراغ دیا ہے:

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ (المزمل/۲۰)	کچھ وہ ہیں جو اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

دولت حاصل کرنے کے بعد اس کا استعمال کس طرح کیا جائے اس کی بھی پوری تفصیل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادی ہے۔ اگر اس تفصیل کے مطابق دولت کا استعمال ہو تو سماج کی وہ ناہمواری ختم ہو جائے گی جو آج ہر سطح پر نظر آرہی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اصولی بات یہ فرمائی کہ جو مال تمھارے پاس ہے وہ اللہ کی عطیہ ہے اس لیے اس کو اس کی مرضی کے مطابق خرچ کرو اس پر مارگنج بن کر نہ بیٹھ جاؤ۔ فرمایا:

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ۔ (الحدید/۷)	اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں ہم نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔
وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ۔ (المنافقون/۱۰)	اور خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے قبل اس کے کہ تم کو موت آئے۔

قرابت داروں پر خرچ

پھر اس انفاق کی شکلیں واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے قرابت داروں پر بھی خرچ کرو اور دوسرے حاجت مندوں پر بھی۔ قرابت داروں کی اہمیت بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَأُوْلُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ۔ (الانفال/۷۵)	اور اللہ کی کتاب میں رحمی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

پھر لوگوں کے مال میں قرابت داروں کا حق بتاتے ہوئے فرمایا:

وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ۔ (بنی اسرائیل/۲۶)	اور قرابت دار کو اس کا حق دو۔

قرابت داروں پر مال خرچ کرنا صلۂ رحمی کی ایک اعلیٰ شکل ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے صلۂ رحمی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ فرمایا:

من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیصل رحمہ[۱۶]	جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے۔

قرآن نے قطع رحمی سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ فرمایا:

اِتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً۔ (النساء/۱)	اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور قرابت داروں سے تعلقات خراب کرنے سے بچو یقین جانو کہ اللہ تمھاری نگرانی کر رہا ہے۔

قطع رحمی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے:

> ''اس سے بڑھ کر قطع رحمی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص دیکھ رہا ہو کہ اس کا رشتہ دار بھوک اور پیاس سے تڑپ رہا ہے اور گرمی یا سردی کے سبب سخت تکلیف میں مبتلا ہے اور وہ اس کو ایک لقمہ کھانا نہ دے اور ایک گھونٹ پانی نہ دے اور وہ اسے ستر پوشی اور سردی گرمی سے بچنے کے لیے کپڑا نہ دے، حتی کہ اسے اپنی چھت کے سائے میں آرام تک نہ لینے دے۔ اگر یہ قطع رحمی نہیں تو ہم نہیں جانتے کہ پھر وہ قطع رحمی کیا ہے جسے حرام کیا گیا ہے؟ اور وہ صلۂ رحمی کیا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے''[۱۷]۔

رہی یہ بات کہ کن کن قرابت داروں پر کتنا کتنا خرچ کیا جائے، قرآن نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ نے ہی اس کی توضیح فرمائی ہے بلکہ اسے خرچ کرنے والے کی وسعت اور حاجت مند قرابت داروں کی ضرورت کی نوعیت پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْساً إِلَّا مَا آتَاهَا ۔ (الطلاق ر ۷)

کشادہ دست اپنی کشادگی کے مطابق خرچ کرے اور تنگ دست اس کے مطابق خرچ کرے جو اللہ نے اس کو دیا ہے اللہ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس نے دیا ہے۔

اگر قرابت داروں کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے تو غربت و افلاس کی جو صورت حال آج پائی جاتی ہے وہ ختم ہو جائے اور مغربی نظریۂ معاش کی جس لعنت کے نتیجہ میں بچے اور عورتیں اپنی غیرت اور عصمت کو داؤ پر لگا کر محنت اور مزدوری کرنے پر مجبور ہیں اس سے نجات مل جائے۔

مغرب کے جس نظریۂ معاش کی وجہ سے آج غربت ایک بہت بڑا مسئلہ بن کے ابھری ہے اس کے مقابلہ میں اسلامی نظریۂ معاش کو فروغ دیا جائے جس کی تفصیل قرآن نے بیان کی ہے تو خواتین، بچوں اور غریبوں کے استحصال کو مکمل طور سے روکا جا سکتا ہے۔ مغربی نظام معاش کی لعنت کی ایک مثال ڈاکٹر یوسف موسیٰ کی زبانی ملاحظہ کیجیے جس کا تجربہ خود انھیں دوران قیام فرانس ہوا۔ لکھتے ہیں:

''شاید یہ بہتر ہو اگر میں یہاں ذکر کروں کہ میں قیام فرانس کے دوران جس گھر میں کچھ عرصہ رہا، وہاں ایک نوجوان لڑکی بحیثیت خادمہ کے رہا کرتی تھی جس کے چہرے سے خاندانی شرافت کے آثار نمایاں تھے، میں نے گھر کی مالکہ سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیوں خادمہ بنی ہوئی ہے؟ کیا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں جو اس سے یہ کام چھڑوا دے اور اس کے لیے زندگی کی آسائشیں فراہم کر دے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ لڑکی شہر کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، اس کا ایک چچا ہے جو بڑا مال دار ہے مگر وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا، میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے معاملہ کو عدالت میں کیوں نہیں لے جاتی کہ وہ اسے چچا سے نان نفقہ دلوائے؟ میرے بات سے وہ صاحبہ حیران رہ گئیں اور انھوں نے

مجھے بتایا کہ ہمارے یہاں ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کے تحت یہ لڑکی اپنے چچا سے ایسا کوئی مطالبہ کر سکے۔ تب میں نے انھیں اس سلسلہ میں اسلام کا حکم سمجھایا، وہ کہنے لگیں، کون ہے جو ہمارے لیے ایسا قانون بنائے؟ اگر ہمارے یہاں یہ قانونی لحاظ سے جائز ہو تو کوئی لڑکی یا عورت ایسی نہ ملے جو کسی کمپنی، کارخانے یا فیکٹری یا حکومت کے کسی محکمے میں کام کرنے کے لیے گھر سے نکلے"۱۸۔

قرآن مجید نے مال داروں کو اپنے قرابت داروں کے ساتھ جس صلۂ رحمی کی تلقین کی ہے اسے ان کے حق سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ "وآت ذا القربی حقہ" سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا صاف مطلب ہوا کہ اگر ان کے ساتھ صلۂ رحمی میں کوتاہی کی گئی تو یہ ان کی حق تلفی ہوگی اور بندوں کی حق تلفی کو اللہ تعالیٰ ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔

غور کیجیے کہ جس نظام معاش کے عملی پہلوؤں کی تفصیل کے پہلو بہ پہلو ترغیب وترہیب، حوصلہ افزائی اور وعید بھی ہو اس کے مفید اور نتیجہ خیز ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر غربت وافلاس واقعی کوئی بڑا مسئلہ ہے تو اسلامی نظام معاش کی عملداری کے بغیر چارہ نہیں، ورنہ توانائیاں صرف ہوتی رہیں گی اور مسائل روز افزوں بڑھتے ہی رہیں گے۔

دیگر غریبوں پر انفاق

اب اسلامی نظام معاش کے اس پہلو پر نظر ڈالیے جس کا تعلق قرابت داروں سے آگے بڑھ کر عام کمزوروں اور بے کسوں سے ہے۔ قرآن نے ان پر مال خرچ کیے جانے کی کئی شکلوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے کچھ لازمی ہیں اور کچھ اختیاری۔ لازمی میں عشر وزکوٰۃ اور صدقۂ فطر ہیں جب کہ اختیاری میں صدقہ وخیرات اور قرض حسن۔

سماج کے جو غریب اور تنگ دست کسی مال دار کے قرابت دار ہیں ان کی مدد کرنا اور ان کی کفالتی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا تو مال دار قرابت داروں پر لازم قرار دیا گیا ہے

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، لیکن ایسے لوگ بھی سماج میں بڑی تعداد میں ہوتے ہیں جن کا کوئی قرابت دار مال دار نہیں ہوتا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ کیونکہ بالعموم قرابت داریاں بھی معیار زندگی کے لحاظ سے ہم پلہ لوگوں کے درمیان ہی قائم ہوتی ہیں۔ ایسے غریبوں اور مفلسوں کی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے عشر وزکوٰۃ، صدقۂ فطر، عام صدقہ وخیرات اور قرض حسن کا نظام بنایا ہے۔

عشر وزکوٰۃ کا نظام

نہ صرف یہ کہ نبی کریم ﷺ کو آج سے چودہ برس پہلے ہی یہ نظام دے دیا گیا تھا اور انھوں نے تجربہ کرکے اسے دکھا بھی دیا ہے بلکہ تمام انبیاء کرام کو یہ نظام عطا ہوا تھا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیائے سابقین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ۔ (الانبیاء/۷۳)

اور ہم نے ان (انبیاء) کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی، نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔

پھر زکوٰۃ کی ادائیگی کو آخرت کی کامیابی سے جوڑا۔ فرمایا:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ. الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ۔ (المومنون/۱-۴)

کامیاب ہوگئے وہ مومنین جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے، لغویات سے پرہیز کرتے اور زکوٰۃ کے نظام پر عمل کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ/۲۷۷)

بے شک وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور زکوٰۃ دی ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، وہاں نہ انھیں کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کا آخرت میں جو فائدہ ہے وہ تو ہے ہی دنیا میں بھی اس سے دو بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

۱- اس سے نفس کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔قرآن کا بیان ہے:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا۔ (التوبۃ/۱۰۳)

اے نبی! تم ان کے مالوں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انھیں بڑھاؤ۔

۲- اس سے ناداروں، کمزوروں اور مجبوروں کی کفالت ہوتی ہے اور تالیف قلب کا بھی سامان ہوتا ہے۔قرآن کہتا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ۔ (التوبۃ/۶۰)

صدقات یعنی زکوٰۃ تو بس فقیروں، مسکینوں اور ران عاملوں کے لیے ہیں جو ان صدقات کے وصول اور تقسیم کرنے پر مامور ہیں اور ان کے لیے ہیں جن کے دل جیتنے ہوں اور گردنوں کو چھڑانے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے اور اللہ کی راہ اور مسافر کے زاد راہ میں یہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ ایک فریضہ ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے بغیر نیکی ،تقویٰ اور پرہیزگاری کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کہتا ہے:

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّآئِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ .... أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (البقرہ/۱۷۷)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، یوم آخرت اور ملائکہ کو، اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے ...... یہی لوگ سچے ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے بلکہ اس پر مار گنج بن کر بیٹھ جاتے ہیں آخرت میں ان کے لیے بڑی سخت سزا کی وعید ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ. يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔ (التوبۃ/۳۴-۳۵)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

ادائیگی زکوٰۃ کے آداب

زکوٰۃ کی ادائیگی کے کچھ آداب ہیں، اگر ان آداب کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو زکوٰۃ دینے کے باوجود ادا نہیں ہوگی۔ وہ آداب حسب ذیل ہیں:

(الف) اسے صرف رضائے الٰہی کے لیے دیا جائے۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔ (البقرہ/۲۷۲)

اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے۔

جو زکوٰۃ رضائے الٰہی کے لیے دی جاتی ہیں اس کی تمثیل قرآن نے یوں بیان کی ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ (البقرہ/۲۶۵)

اور جو لوگ اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی سی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے۔

(ب) وہ ریا و نمود سے پاک ہو۔

وَمَا أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ. إِن تُبْدُواْ الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاء فَهُوَ خَيْرٌ لُّكُمْ۔ (البقرہ/۲۷۰، ۲۷۱)

اور تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہے یا جو نذر بھی مانی ہے اللہ کو اس کا علم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر دو اور حاجت مندوں تک پہنچادو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

ریا کار کے انفاق کی تمثیل قرآن نے یوں بیان کی ہے:

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْداً لاَّ يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُواْ۔ (البقرہ/۲۶۴)

اور اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اب صرف چٹان چکنی سی رہ گئی ایسے لوگ صدقہ کرکے جو نیکی کماتے ہیں اس سے ان کو کچھ بھی فائدہ نہیں ملتا۔

(ج) جس کو زکوٰۃ دی جائے اس پر نہ احسان جتایا جائے اور نہ اسے اذیت دی جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تُبْطِلُواْ صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالأذَى۔ (البقرہ/۲۶۴)

اے ایمان والو! تم احسان جتا کر اور دکھ دے کر اپنے صدقات کو برباد نہ کرو۔

(د) زکوٰۃ میں گھر کا کوڑا کباڑا نہ صاف کیا جائے بلکہ اپنا پسندیدہ مال دیا جائے۔ قرآن کہتا ہے:

لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ۔ (آل عمران/۹۲)

تم نیکی ہرگز نہیں کما سکتے جب تک اپنے اس مال میں سے نہ دو جو تمھیں پسند ہے۔

زکوٰۃ عائد کرنے میں عدل کا لحاظ

اللہ تعالیٰ نے جو زکوٰۃ مسلمانوں پر عائد کی ہے اس میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا پورا ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مال تمام کا تمام اللہ کا ہے، اس کے دینے سے لوگوں

کو ملا ہے، اگر وہ نہ دے تو محنت کے باوجود نہیں مل سکتا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بعض محنت کشوں کو زیادہ ملتا ہے اور بعض کو کم، بعض کو بہت زیادہ ملتا ہے اور بعض کو بہت کم یا کچھ بھی نہیں؟ دراصل اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو دیتا ہے ان کا بھی امتحان لیتا ہے انھیں دے کر اور جن لوگوں کو نہیں دیتا ان کا بھی امتحان لیتا ہے نہ دے کر۔ البتہ اس نے نظام ایسا بنایا ہے کہ مال سب کے استعمال میں آجائے۔ اس نظام میں زیادہ مال اس کے استعمال میں آتا ہے جو کماتا ہے لیکن محروم کوئی نہیں رہتا، کسی نعمت کی تقسیم کا اس سے بہتر نظام ممکن نہیں۔

مصارف زکوٰۃ

زکوٰۃ کا مال جن لوگوں کے استعمال میں آتا ہے وہ کل آٹھ قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں کچھ تو اس اعانت کے محتاج ہیں، کچھ اس نظام زکوٰۃ سے وابستگی کی وجہ سے اسی کے لیے وقف ہیں۔ اب اگر انھیں اس زکوٰۃ سے کچھ نہ ملے تو یا تو وہ اس نظام سے علیحدگی اختیار کرلیں گے یا تھوڑے ہی عرصے میں وہ بھی نادار ہوجائیں گے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کی تالیف قلب مقصود ہے۔

ان آٹھوں مصارف کا ذکر اس آیت میں ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ (التوبۃ/۶۰)

صدقات (زکوٰۃ) تو بس فقیروں، مسکینوں اور ان عاملوں کے لیے ہیں جو ان صدقات کے وصول اور تقسیم کرنے پر مامور ہیں اور ان کے لیے ہیں جن کی تالیف قلب مقصود ہو اور گردنوں کو چھڑانے، قرض داروں کے قرض اتارنے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کے زادراہ میں۔ یہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے۔

الفقراء: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس نہ مال و دولت ہے اور نہ وہ مال کمانے کی قدرت رکھتے ہیں:

المساکین: اس سے مراد وہ محتاج ہیں جو دوسروں کے سامنے اپنی محتاجی کا

اظہار نہیں کرتے لیکن محتاجی ان کے سراپا سے ٹپکتی ہے۔

العاملین علیها: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے کاموں سے وابستہ ہیں۔

المولفة قلوبهم: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام سے بہت قریب نہیں ہیں لیکن اگر ان کی مالی مدد کی جائے تو قریب آسکتے ہیں۔

فی الرقاب: اس سے مراد وہ غلام ہیں جو اپنے آقاؤں کی مرضی کے پابند ہیں۔

الغارمین: اس سے مراد وہ قرض دار ہیں جو اپنے قرض کی ادائیگی پر قادر نہیں ہیں۔

فی سبیل الله: اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں وہ سارے لوگ آتے ہیں جو میدان جہاد میں سرگرم عمل ہوں یا غلبہ واشاعت اسلام کے کاموں میں مصروف ہوں۔

ابن السبیل: اس سے مراد وہ مسافر ہیں جو دوران سفر امداد کے محتاج ہو گئے ہوں۔قطع نظر اس سے کہ وہ فی الواقع مال دار ہیں یا غریب۔

صدقہ وخیرات

اختیاری انفاق کی متعدد شکلوں میں سے ایک صدقہ وخیرات ہے۔عشر وزکوٰۃ اور صدقۂ فطر تو ایک واجبی فریضہ ہے جس سے صرف ایک قانونی عمل سامنے آتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انفاق کی ان شکلوں کی بھی ترغیب دی ہے جن سے اخلاقی عمل بھی سامنے آسکے اور جب تک قانون کے ساتھ اخلاق کی عمل داری بھی نہ ہو سماج کی برکتوں کا ظہور نہیں ہوتا۔قانونی عمل سے نجات کی راہ کھلتی ہے جب کہ اخلاقی عمل سے درجات کا تعین ہوتا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْراً وَأَعْظَمَ أَجْراً۔ (المزمل/۲۰)

اور جو مال بھی تم اپنی فلاح کے لیے خرچ کرو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے، ایسا انفاق بہتر اور اجر کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔

الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرّاً وَعَلاَنِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ/۲۷۴)

جو لوگ اپنا مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ وہاں نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے ہی نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً. إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاء وَلَا شُكُوراً۔ (الدھر/۸،۹)

اور یہ مسکین تیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے رہے ہیں خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے بھی اس جذبہ کے ساتھ کہ ہم تمھیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں اور نہ شکریے کے۔

اسی طرح انفاق کی مثال اللہ تعالیٰ نے یوں دی ہے:

مَّثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّئَةُ حَبَّةٍ وَاللّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ. الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ ثُمَّ لاَ يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُواُ مَنّاً وَلاَ أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ/۲۶۱-۲۶۲)

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اور اللہ جسے چاہتا ہے بڑھا کر دیتا ہے اللہ کشادگی اور علم والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

قرض حسن

قرض حسن اس قرض کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی ضرورت پر کسی ضرورت مند کو دیا جاتا ہے لیکن اس کی واپسی کی شرط نہیں ہوتی۔ حالات بہتر ہوں اور واپسی کا امکان ہو تو

واپس کردے ورنہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور بالعموم اس کا اطلاق انھیں قرضوں کے لیے ہوتا ہے جن کی واپسی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

مَّن ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضاً حَسَناً فَیُضَاعِفَہُ لَہُ أَضْعَافاً کَثِیْرَۃً وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ وَإِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ (البقرہ/۲۴۵)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے۔ (اس پر تعجب نہ ہو کیونکہ) گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور تم سب کو پلٹ کر اسی کی طرف جانا بھی ہے۔

لازمی انفاق کے علاوہ یہ اختیاری انفاق کی شکلیں ہیں۔ اگر انفاق کی ان تمام شکلوں کا چلن عام ہو جائے تو سماج میں غریبی کا باقی رہنا ممکن نہیں۔ اور اگر کچھ باقی بھی رہے تو اس درجہ کی غربت نہیں ہو سکتی جس میں انسان انسان نہیں رہ جاتا بلکہ بہائم کی صف میں چلا جاتا ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ کیا موجودہ عالمی نظام معاش میں اس نظام کی عمل داری ہے؟ اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا معاشرے سے غربت کے خاتمہ کی کوئی اور سبیل ہے؟ یہ عہد حاضر کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اگر اس سنگین مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا تو دنیا سے رہزنی اور غارت گری کو روکا نہیں جا سکتا۔

سیاسی شعور کا فقدان

اس عہد کا ایک بہت بڑا مسئلہ سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی کے بغیر اس کی انسانی ضروریات کی تکمیل ممکن نہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر اور شر دونوں کی آزادی دے رکھی ہے اس لیے اس بات کا امکان قوی ہے کہ کچھ لوگ خیر پسند ہوں تو کچھ لوگ شر پسند۔ خیر پسندوں سے خیر ہی پھیلے گا اور یہ جتنا بھی پھیلے سماج کے لیے اچھا ہے لیکن شر پسندوں سے شر ہی فروغ پائے گا اور اس کا فروغ پانا سماج کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شر کو روکنے کی تدبیر ضروری ہے اور یہ تدبیر بار آور نہیں ہو سکتی جب تک

طاقت نہ ہو اور طاقت بھی ایسی کہ اگر سماج کا بڑا حصہ اس شر کی لپیٹ میں آ جائے تو اسے قابو میں کیا جا سکے۔ یہ طاقت تنہا ایک فرد کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہوگی، ایک نظام کی ضرورت ہوگی اور اس نظام کے کل پرزوں کے درمیان تقسیم کار کی ضرورت ہوگی۔ ایک جماعت ایسی ہوگی جس کے افراد انتظامیہ سے تعلق رکھتے ہوں، کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو انتظامیہ کے فیصلوں کو نافذ کریں، کچھ ایسے بھی ہوں گے جو حسب حالات وضرورت جزوی قوانین وضع کریں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو لوگوں کے معاملات کا غیر جانب دارانہ جائزہ لے کر ان کے سلسلہ میں دوٹوک فیصلہ کرنے والے ہوں۔ کچھ لوگوں کو یہ ذمہ داری بھی انجام دینی ہوگی کہ وہ ارکان حکومت کو صحیح مشورہ دے سکیں اور ان کی خامیوں پر انھیں متوجہ کر سکیں۔ ان تمام شعبوں پر مشتمل ایک بڑا عملہ درکار ہوگا تاکہ اتنی عظیم اجتماعیت کو کنٹرول کر سکیں اور ان کے اجتماعی نظام کو چلا سکیں۔ انہی لوگوں کے مجموعہ کا نام حکومت ہے اور حکومت سے وابستہ ان افراد کو جو اپنے فہم وتدبر سے اس نظام کو چلاتے ہیں آج کی اصطلاح میں سیاست داں کہا جاتا ہے۔ سیاست دانوں میں سیاست دانی یا بالفاظ دیگر سیاسی شعور انتہائی ناگزیر ہے۔ لیکن اس وقت پوری دنیا میں جس طرح کے سیاست دانوں کے ذریعہ سیاسی نظام چل رہا ہے وہ کچھ اور ہوں تو ہوں لیکن واقعی معنوں میں سیاست داں بالکل نہیں ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ سیاسی ڈھانچے میں بے شمار خامیاں ہیں۔

سیاست کا حقیقی مفہوم

سیاست کے لغوی معنیٰ ہیں سکھانا، سدھانا اور معاملات کی تکمیل کا انتظام کرنا۔ اس کا اصطلاحی مفہوم ہے انجمن، سوسائٹی یا ملک کے انتظامی امور کو حکمت وتدبیر کے ساتھ سنبھالنا۔

موجودہ سیاسی صورت حال

اس وقت پوری دنیا میں سیاست کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اقتدار پانے

کے بعد نظام مملکت کو اپنے فکر کے مطابق اپنے متعین کردہ خطوط پر چلایا جائے۔ خواہ اس کے لیے عوام اور املاک کی کتنی ہی بڑی تباہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے الگ الگ منشور ہوتے ہیں اور جو سیاسی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے وہ اپنے منشور کو نافذ کرتی ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب اس کے بعد دوسری پارٹی آتی ہے تو وہ سابق برسر اقتدار پارٹی کے تمام فیصلوں کو کالعدم قرار دے کر ملک کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے اس کے باشندوں کے لیے کچھ نئی قسم کی پیچیدگیاں پیدا کردیتی ہے اور جب عوام میں اس کے خلاف بے چینی بڑھتی ہے تو اگلے الیکشن میں وہ دوسری پارٹی کو اقتدار میں لے آتے ہیں اور جب وہ پارٹی آتی ہے تو وہ اپنا منشور لاگو کرتی ہے۔ اس طرح ادھیڑ بن کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اس وقت بد قسمتی سے عالمی سطح پر یہی تصور سیاست جاری وساری ہے۔

موجودہ سیاسی تصور کی خامیاں

اس تصور سیاست میں کئی بڑی اور بنیادی خامیاں ہیں جن کا جائزہ ضروری ہے۔

پہلی خامی

کسی بھی ملک کا سیاسی منشور ایسا نہیں ہے جس میں اس بات کو بھی کوئی اہمیت دی گئی ہو کہ یہاں کا اصل حکمراں خالق کائنات ہے جس نے انسانوں کو اس لیے دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق کائنات کی اشیاء کا استعمال کریں اور اس کی مرضی کے مطابق ہی نظام مملکت چلائیں۔

دوسری خامی

دنیا کی تمام حکومتوں کا کوئی ایسا وفاق نہیں ہے جو کچھ بنیادی اخلاقی اصولوں پر قائم ہو۔

تیسری خامی

الیکشن لڑنے والوں کے لیے اس کی واقعی اہلیت کا کوئی ضابطہ موجود نہیں ہے جس کے نتیجہ میں صرف وہ افراد حکومت کے لیے منتخب ہوں جو باصلاحیت، مخلص، انسانیت دوست اور خداترس ہوں۔

چوتھی خامی

جن پارٹیوں کے منشور میں جبر وتشدد اور فرقہ پرستی کے عناصر شامل ہوں ان کے الیکشن لڑنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

اسلامی تصور سیاست

شکر ہے کہ اب دین دار طبقہ بھی یہ تسلیم کرنے لگا ہے کہ سیاست کو زندگی سے بے دخل کرکے باعزت زندگی نہیں گزاری جاسکتی، ورنہ ابھی تک تو یہی کہا جاتا تھا کہ سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اب جب کہ سیاست کو بھی مذہب کا حصہ مانا جانے لگا ہے اسلامی تصور سیاست کو سمجھانا قدرے آسان ہے۔

قرآن مجید نے جو اسلامی تصور سیاست وحکمرانی پیش کیا ہے اس کے دو بنیادی اجزاء ہیں۔

۱- حکمرانوں اور سیاست دانوں کے فرائض۔

۲- عوام کی ذمہ داریاں۔

حکمرانوں کے فرائض

حکمرانوں کے دس بہت بنیادی فرائض ہیں۔

۱- عوام کی جان کے تحفظ کو یقینی بنائیں اور خود احترام جان کا ثبوت دیں۔

قرآن کہتا ہے:

لَا تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ (بنی اسرائیل/۳۳)
تم اس نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔

۲- ان کے مالوں کا تحفظ کریں، نہ خود دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کریں اور نہ دوسروں کو ہاتھ صاف کرنے دیں۔

لَا تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ۔ (البقرہ/۱۸۸)
تم ایک دوسرے کے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔

۳- کسی کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچنے دیں۔ نہ خود ٹھیس پہنچائیں اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیں۔

لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاء مِّن نِّسَاء عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ۔ (الحجرات/۱۱)
کوئی قوم کسی دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کی کوئی جماعت عورتوں کی دوسری جماعت کا مذاق اڑائے ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں، نہ تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ اور نہ برے القاب سے پکارو۔

اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً۔ (الحجرات/۱۲)
بہت زیادہ گمانوں سے بچو بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور دوسروں کی نجی زندگی میں نہ جھانکو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔

البتہ حکومت کو اس تجسس کی اجازت ہے جو بغرض اصلاح ہو۔

۴- بھلائیوں کو فروغ دیں اور برائیوں کو روکیں۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (آل عمران/۱۱۰)
تم بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے لوگوں کے لیے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

۵- کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر نہ تو مجبور کریں اور نہ کسی کو مجبور کرنے دیں۔

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ۔ (یونس/۹۹)
تو کیا تم لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرو گے یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں؟

۶- نہ کسی کی مذہبی دل آزاری کریں اور نہ کسی کو اس کی اجازت دیں۔

وَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ۔ (الانعام/۱۰۸)
اور تم ان کو برا بھلا نہ کہو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔

۷- بلا تحقیق کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔

إِن جَاءكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۔ (الحجرات/۶)
اور اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کے خلاف کارروائی کر بیٹھو پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

۸- حاجت مندوں اور محروموں کی ضروریات زندگی کی فراہمی کو اپنا فریضہ تصور کریں۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔ (الذاریات/۱۹)
اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

۹- رعایا کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کریں۔

اِعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى۔ (المائدہ/۸)
عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

۱۰- کسی کے جرم کی سزا دوسرے کو نہ دیں۔

لاَ تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلاَّ عَلَيْهَا وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى۔ (الانعام/۱۶۴)
ہر شخص جو کچھ کرے گا اس کا وبال اس کے سر ہوگا کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ان قرآنی ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کا منصب عطا فرمایا ہے ان سے وہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ عوام کے جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنائیں،

ان کی عزت نفس کا خیال رکھیں، سماج میں بھلائیوں کو فروغ دینے کے امکانات پیدا کریں اور برائیوں کو پروان چڑھانے والے عوامل پر قدغن لگائیں، تبدیلیٔ مذہب پر مجبور کرنے والوں کے خلاف کارروائی کریں، مذہبی دل آزاری کے مرتکبین کو سزائیں دیں، بلا تحقیق کسی کے خلاف کارروائی نہ کریں، تحقیق میں جانب داری کا مظاہرہ نہ کریں، تحقیق سے پہلے شک کی سوئی کسی طرف نہ گھمادیں، ریاست کے تمام کمزوروں، مظلوموں، غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات زندگی کی فراہمی کو اپنی ذمہ داری سمجھیں، کسی کو دینے کے لیے دوسرے کی حق تلفی نہ کریں، رعایا کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کریں اور کسی کے جرم کی سزا اس کے دوستوں، گھر والوں، رشتہ داروں یا ہم عقیدہ وہم مسلک لوگوں کو نہ دیں۔

پوری دنیا پر نظر دوڑا کر دیکھیے کیا یہ سیاسی شعور کہیں نظر آرہا ہے؟ بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھا جارہا ہے کہ کسی مسئلہ میں اگر کسی حکومت یا اس کے کسی اہل کار نے حقیقت پسندی کی جرأت کی تو افراد، جماعتیں، پارٹیاں اور حکومتیں سب اس کو حق گوئی کی سزا دینے کے لیے تیار دکھائی پڑتی ہیں۔

بتائیے! کیا یہ اس عہد کا ایک سنگین مسئلہ نہیں ہے؟

عوام کی ذمہ داریاں

اسی طرح ہر ریاست اور حکومت کے عوام کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کی ادائیگی ایک اچھی حکومت و ریاست کے لیے ضروری ہے۔

عوام کی پانچ اہم ذمہ داریاں ہیں:

۱- اپنے ذمہ داروں اور حکمرانوں کی اطاعت کریں۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ۔ (النساء/۵۹)

اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔

۲- ملک میں بدامنی پھیلانے سے گریز کریں۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلاَفٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الْأَرْضِ۔ (المائدہ/۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے محاذ آرائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کا بدلہ صرف یہ ہے کہ وہ قتل کردیے جائیں یا انھیں پھانسی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا وہ اس سرزمین سے بے دخل کردیے جائیں۔

۳-ضرورت پڑنے پر وہ حکومت کو جانی و مالی تعاون دیں۔

انفِرُواْ خِفَافاً وَثِقَالاً وَجَاهِدُواْ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ (التوبہ/۴۱)

تم نکلو ہلکے اور بوجھل اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔

۴-نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حکومت کا ساتھ دیں۔

تَعَاوَنُواْ عَلَى الْبرِّ وَالتَّقْوَى۔ (المائدہ/۲)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں مدد کرو۔

۵-حق تلفی اور ظلم وزیادتی میں اس کا ساتھ نہ دیں۔

وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ/۲)

حق تلفی اور زیادتی کے کاموں میں مدد نہ کرو۔

یہ ہیں عوام اور رعایا کی ذمہ داریاں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ نہ حکومتیں اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں اور نہ عوام اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ یہ سیاسی شعور ہر ایک میں ناپید ہے۔ اسی لیے حکومتوں کے مظالم بھی بڑھ رہے ہیں اور عوام کے اضطراب میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اس عہد کا ایک بڑا مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دہشت گردی

کوئی بھی اخبار پڑھیے، ریڈیو یا ٹی وی کا نشریہ سنیے دہشت گردی

"Terrorism" کے الفاظ جگہ جگہ نظر آتے اور بار بار کان کے پردوں سے ٹکراتے ہیں۔ کسی ملک کی پارلیمنٹ ہو، کسی پارٹی کی کوئی میٹنگ ہو یا دو ملکوں کے رہنماؤں کے درمیان کا سمجھوتا ہو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے معاہدہ سے خالی نہیں ہوتا۔ گویا یہ الفاظ اس عہد کے سب سے زیادہ استعمال ہونے والے اور پامال الفاظ ہیں۔ میڈیا بھی دہشت گردی کو عصر حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ باور کرا رہا ہے۔

دہشت گردی کی تعریف

دہشت گردی کے لغوی معنیٰ ہیں دہشت پھیلانا۔ البتہ اس کی اصطلاحی تعریف ملکوں اور علاقوں کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مصنف نے اس کی تعریف یہ کی ہے:

''دہشت گردی نام ہے منصوبہ بند طریقے سے خوف و ہراس پھیلانے اور تشدد کے غیر متوقع طریقے استعمال کرنے کا، جن کا ارتکاب عوام یا افراد کے خلاف سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کیا گیا ہو'' [۱۹]۔

اس تعریف کی رو سے دہشت گرد حکومت یا سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں۔

۱۹۸۰ء میں امریکہ کی CIA نے دہشت گردی کی یہ تعریف کی ہے:

''سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تشدد یا خوف و ہراس کا استعمال کرنا، چاہے ایسا کسی فرد کی طرف سے کیا گیا ہو یا کسی گروہ کی طرف سے، چاہے کسی قائم شدہ حکومت او ر جماعت کے خلاف ہو یا اور کسی کے خلاف۔ البتہ اس کے پیش نظر جن کے اوپر حملہ کیا گیا ہو ان کو دہشت زدہ کرنا مقصود ہو'' [۲۰]۔

برطانیہ کی حکومت نے ۱۹۷۴ء میں دہشت گردی کی یہ تعریف کی تھی:

''قانون کی نظر میں دہشت گردی نام ہے سیاسی مقاصد کے لیے تشدد کے استعمال کا جس میں عوام کے کسی حصہ کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنا شامل ہو'' [۲۱]۔

انڈین نیشنل سیکورٹی گارڈ ایکٹ ۱۹۸۶ء میں دہشت گردی کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''دہشت گرد ایسا شخص ہے جو کسی قانون کے ذریعہ قائم شدہ حکومت کو مرعوب و معطل کرنے کی غرض سے یا عوام یا ان کے کسی طبقے میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے بم، ڈائنا مائیٹ یا آتش گیر اشیاء یا پھٹ پڑنے والی اشیاء یا گولی چلانے والے ہتھیار یا دوسرے قاتلانہ ہتھیار، زہریلی گیس یا دیگر خطرناک وتباہ کن مادہ کا اس طرح استعمال کرتا ہے جو کسی کی موت، کسی کے زخمی یا مال و اسباب کی تباہی یا قوم کی زندگی کی ضروریات کی ترسیل کے نظام کو درہم برہم کرنے کا ذریعہ ہو''[۲۱]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دہشت گردی کا وجود دنیا میں مختلف صورتوں میں ہے اور اس سے انسانی آبادی سخت پریشان، خوف زدہ اور جسمانی و مالی بحران کی شکار ہے۔ بوسنیا، چیچنیا، فلسطین، عراق، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان میں بھی اربوں کا مالی نقصان، لاکھوں انسانوں کا قتل، بے شمار خواتین کی بے حرمتی، ہزاروں انسانوں کی ذہنی و جسمانی معذوری، ہزاروں بے گناہ نوجوانوں کی گرفتاری، دینی تعلیمی اداروں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش اور مساجد کے کردار کو داغ دار بنانے کی سازش اسی دہشت گردی کا شاخسانہ ہے۔ اس دہشت گردی کی کارروائی میں عوام بھی شریک ہیں اور خواص بھی، ریاستی حکومتیں بھی شریک ہیں اور مرکزی بھی، ملکی ارباب اختیار بھی شامل ہیں اور بین الاقوامی بھی۔

دہشت گردی کا خاتمہ کیسے

سوال یہ ہے کہ اس دہشت کا مقابلہ اور خاتمہ کیسے ہو؟ کیا دہشت گردی کا مقابلہ دہشت گردی ہی سے کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا دہشت گردی بمقابلہ دہشت گردی مزید دہشت گردی کو ہوا نہیں دے گی؟ اس وقت ایک اچھی بات یہ سننے کو مل رہی ہے کہ دنیا نے

طے کرلیا ہے کہ دہشت گردی کا خاتمہ کر کے رہیں گے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دہشت گردی کا خاتمہ ان اصولوں کو اپنائے بغیر ممکن نہیں جو اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں اور جن کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے۔

قرآن مجید میں خالق کائنات کا ارشاد ہے:

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ (الانعام/۱۵۱)

تم اس نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔

قرآن نے ایک دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا:

مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِی الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعاً۔ (المائدہ/۳۲)

جس نے کسی انسان کو قتل کیا بغیر اس جرم کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی تو گویا اس نے سارے انسانوں کو زندگی بخشی۔

اس آیت نے دہشت گردی کا خاتمہ چاہنے والوں کے لیے چار اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان چاروں اصولوں کی روشنی میں دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کر سکتے ہیں۔

۱- قاتل کو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۲- زمین میں فساد پھیلانے والے قابل گردن زدنی ہیں۔

۳- ناحق کسی انسان کا خون بہانا پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

۴- کسی انسان کی جان بچانا سارے انسانوں کی جان بچانے کے ہم معنیٰ ہے۔

اسی طرح جن لوگوں کو اپنی جان کا خطرہ ہو انھیں یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ان کے خلاف اقدام کر سکتے ہیں جن سے جان کو خطرہ لاحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۔ (الحج/۳۹)

جنگ کی اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔

اسی طرح مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی سرکوبی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۔ (النساء/۷۵)

اور آخر کیوں نہیں تم لڑتے ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنھیں کمزور پا کر دبایا گیا اور وہ اللہ کی بارگاہ میں فریاد کررہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال لے جس کے باشندے ظالم ہیں۔

یہ ذمہ داری اصلاً حکومت کی ہے۔ اسے یہ بھی پتہ لگانا ہے کہ واقعی کون ظالم ہے اور کون مظلوم اور ظالم کے خلاف کارروائی کر کے مظلوم کی مدد بھی کرنی ہے لیکن اگر حکومت ہی ظالم ہو تب کیا کیا جائے، ایسی صورت میں عوام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ حکومت کو ظلم سے روکے اور اس کے خلاف اس وقت تک محاذ آراء رہے جب تک اس ظلم و زیادتی کا سد باب نہ ہو جائے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ ۔ (البقرہ/۱۹۳)

اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

لیکن انتقامی کارروائی میں بھی ظلم کا ارتکاب کرنے یا حد سے تجاوز کر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

وَقَاتِلُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ (البقرہ/۱۹۰)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے برسرِ پیکار ہیں مگر زیادتی نہ کرنا بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور اگر کوئی شخص زیادتی کر رہا ہے تو اس کے خلاف اس کی زیادتی کے بقدر ہی کارروائی کرنے کی اجازت ہے۔

فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۔ (البقرہ/۱۹۴)

اور جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کے خلاف اسی کے مثل کارروائی کرو اور اللہ سے ڈرو۔

وہ ارباب اقتدار جو ظلم وزیادتی کرتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ نے ظلم وزیادتی سے یہ کہہ کر روکا کہ لوگ عام طور پر اقتدار پا کر ظلم وزیادتی کرنے لگتے ہیں جو انھیں زیب نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ ان کی اس زیادتی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (البقرہ/۲۰۵)

اور جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی تگ ودو کا محور یہ بن جاتا ہے کہ وہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے، ایسے لوگ فسادی ہیں حالانکہ اللہ کو فساد پسند نہیں۔

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات بتاتی ہیں کہ کسی کو کسی پر زیادتی کرنے، کسی کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے، اس کی جان لینے اور زمین میں فساد پھیلانے کی اجازت نہیں ہے۔

اگر ان قرآنی اصولوں پر عمل کیا جائے تو دہشت گردی کا خاتمہ بہت جلد ہو سکتا ہے لیکن چونکہ حقیقی دہشت گردی سے بالعموم چشم پوشی کی جاتی ہے اور فرضی دہشت گردی کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ افراد اور قوموں کو تو ختم کیا جا سکتا ہے لیکن دہشت گردی کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

میرے نزدیک بڑے عصری مسائل یہی ہیں باقی مسائل انہی کی دین ہیں۔ بڑے اور اساسی مسائل کو ختم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تو جو مسائل ان کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں وہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

حواشی ومراجع

۱ الامام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری، کتاب العلم، باب السمر فی العلم

۲ صحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ

۳؎ صحیح البخاری، کتاب العلم ، باب العلم والعظة بالليل

۴؎ الامام محمد بن عیسی الترمذی، جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة

۵؎ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج ا، تفسیر سورۃ البقرہ، آیت ۴۵

۶؎ صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صوم الدهر

۷؎ الامام ابوالحسین مسلم بن الحجاج، الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهى عن التحاسر والتباغض والتدابر

۸؎ الامام أبوداؤد سلیمان بن الاشعث، سنن أبی داؤد، کتاب الادب، باب النصيحة

۹؎ صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ ، باب وجوب الزکوٰۃ

۱۰؎ علامہ یوسف القرضاوی، اسلام اور معاشی تحفظ (ترجمہ: عبدالحمید صدیقی) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، باردوم، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱

۱۱؎ حوالہ مذکور، ص ۱۲

۱۲؎ حوالہ مذکور، ص ۱۳

۱۳؎ حوالہ مذکور، ص ۱۳-۱۴

۱۴؎ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، گلوبلائزیشن اور اس کے معاشی و ثقافتی اثرات، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۱۶

۱۵؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں خاکسار کا مضمون ''قرآن مجید کا تصور اصلاح'' چھٹی قسط ''معیشت''، سہ ماہی رسالہ نظام القرآن، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، ج ۱۰، شمارہ ۳

۱۶؎ سنن ابی داؤد، كتاب البر والصلة، باب صلة الرحم

۱۷؎ علامہ ابن قیم، زاد المعاد، بحوالہ اسلام اور معاشی تحفظ، ص ۵۵

۱۸؎ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، اسلام اور انسانی دنیا کو اس کی ضرورت، بحوالہ اسلام اور معاشی تحفظ، ص ۶۴

۱۹؎ مفتی محمد مشتاق تجاروی، دہشت گردی اور اسلامی تعلیمات، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۸

۲۰؎ حوالہ مذکور، ص ۱۰

۲۱؎ D.P. Sharma, *Countering Terrorism*، بحوالہ عبدالباری، اسلام اور دہشت گردی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۶